قسط نمبر 33

بستامی پورا ایک ہفتہ ہسپتال میں رہا تھا۔ اس ایک ہفتے میں بستامی کے پاس رحبانی اور کومل رہے تھے۔ حویلی میں سے کوئی بھی ہسپتال نہیں گیا تھا۔ سب کو بستامی کے حوالے سے فکر تو تھی لیکن کومل نے پہلے ہی دن ماحول کو اس قدر خراب کر دیا تھا کہ کوئی بستامی کی خیریت پوچھتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ حاجی بوا رحبانی سے پوچھ کر باقی سب کو بتا دیا کرتی تھیں۔ سلمان ہسپتال میں کھانا دے آیا کرتا تھا۔ وہ کھانا حویلی سے نہیں جاتا تھا۔ شاید یہ کومل کی سلمان کو تاکید تھی کہ کھانا باہر سے آئے۔

ایک ہفتے کے بعد بستامی کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی تھی اور وہ گھر آ گیا تھا۔ ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تہمینہ، زہرہ اور شکیلہ پھپھو صدر دروازے میں اس کے استقبال کے لیے کھڑی ہوئی تھیں۔ جب گاڑی میں سے اترتے ہی کومل نے انہیں دیکھ کر منہ بنا لیا۔

''اس دکھاوے کی ضرورت نہیں ہے اب...... آپ سب کی اصلیت میں جان چکی ہوں۔ بہتر ہے کہ آپ اپنے کمروں میں چلی جائیں۔''

کومل کے سخت لہجے پر تینوں پھوپھیاں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ اور پھر چار و ناچار اپنے اپنے کمروں کی طرف چلی گئیں۔ رحبانی اور سلمان، بستامی کو سہارا دیتے ہوئے کمرے میں لائے تھے۔

بستامی پوری طرح سے صحت یاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا چہرہ کچھ ایسے بگاڑ کا شکار ہو گیا تھا کہ دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے اسے فالج یا لقوہ ہو چکا ہو۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اس کے چہرے اور گردن کے مسلز خراب ہو چکے

ہیں۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ شاید ٹھیک ہو جائیں۔ بستامی بات کرتا تھا تو اس کی آواز ایسے نکلتی تھی جیسے دو چار بستامی ایک ساتھ بول رہے ہوں۔ اس کے منہ کا ٹیڑھا پن بھی کافی نمایاں تھا۔

''تمہارے یہ سب رشتے دار...... یہ انتہائی گھٹیا لوگ ہیں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ، پھر ان سب کو میں ٹھیک کرتی ہوں۔''

رحبانی اور سلمان کے کمرے سے جانے کے بعد کومل غصے سے اول فول بکنے لگی۔ بستامی بیڈ کی پشت سے کمر ٹکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ بولنے میں کومل کا ساتھ دے سکتا۔ وہ بس سر ہلانے پر ہی اکتفا کر رہا تھا۔

''سب سے پہلے اس حویلی کو بیچنا ہے۔ بہت ہو گئی خدا ترسی...... چاند اپنا حصہ لے کر جہاں مرضی جائے۔ اور تینوں پھوپھیاں بھی بے شک اس کے ساتھ ہی کہیں دفع ہو جائیں۔ میں تو اب کسی پر رحم نہیں کرنے والی۔''

آئینے کے سامنے بیٹھ کر کومل آنے والے دنوں کے حوالے سے منصوبہ بندی بتانے لگی۔ اس کی ساری منصوبہ بندی بستامی کی صحت یابی کے ساتھ جڑی ہوئی تھی کیونکہ بہت سے کام وہ اکیلی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے بستامی کے صحت یاب ہو جانے کا انتظار کرنا تھا۔

بستامی کافی نحیف ہو چکا تھا۔ اسے سہارا دے کر چلایا پھرایا جاتا تھا۔ سلمان اسے غسل خانے لے جاتا تھا اور وہ ہی اسے نہلاتا تھا۔ بستامی کی خوراک بھی ابھی بس ساگودانہ اور دلیہ پر محیط تھی۔ اس کی صحت بحال ہونے میں نجانے کتنا وقت لگ سکتا تھا۔ رحبانی اس کو دیکھ دیکھ کر روتا رہتا تھا۔ اور رحبانی کو روتا دیکھ کر حاجی بوا پریشان ہوتی رہتی تھیں۔ ماں باپ کے مرجانے کے بعد دونوں کے پاس گنے چنے سہارے تھے جن کے تحت وہ زندگی گزار رہے تھے۔

سلمان دل و جان سے بستامی کی خدمت کر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے بستامی کچھ صحت مند ہو رہا

تھا۔ لیکن اس کی صحت مندی میں کچھ کمیاں رہ جانے والی تھیں۔ بستامی کی آواز اب عمر بھر ٹھیک نہیں ہونے والی تھی۔ اور اس کی گردن کے مسلز کچھ ایسے طور پر خراب ہو چکے تھے کہ بستامی کو ہر تھوڑی دیر کے بعد اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پہلے دائیں طرف گردن کو جھکاتے ہوئے ایک جھٹکا دینا پڑتا تھا اور پھر بائیں طرف جھکاتے ہوئے ایک جھٹکا دینا پڑتا تھا۔ آنے والے وقت میں یہ بستامی کی عادت بھی بن چکی تھی۔

''خدا کی سزا شروع ہو چکی ہے۔'' بستامی کو ایسا کرتے ہوئے دیکھ کر چاند سوچا کرتی تھی۔ ''خدا تجھے ایسے ہی تھکائے گا بستامی!''



روشن بیگم نے رحبانی سے کہا تھا کہ وہ اب ایمن سے شادی کر لے۔ ان کی زندگی کا کچھ پتا نہیں ہے کہ وہ کب ختم ہو جائے۔ رحبانی نے انہیں رضامندی دے دی تھی لیکن وہ کس دن ایمن کو رخصت کر کے لے کر جانے کے لیے آنے والا تھا، وہ یہ نہیں بتا پا رہا تھا۔

روشن بیگم اس سے بارہا پوچھ چکی تھیں لیکن رحبانی کوئی نہ کوئی عذر گھڑ لیتا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ کسی بندھن میں بندھ جانے سے ڈر رہا تھا۔ اسے لگنے لگا تھا کہ جیسے ہی وہ ایمن سے نکاح کرے گا، اسی دن اس کی موت ہو جائے گی۔ اسے بندھن میں بندھ جانا جیل میں بند ہو جانے جیسا لگ رہا تھا۔ لیکن پھر ایک دن ایمن نے اس سے ایسی بات کہی کہ رحبانی مزید کوئی بہانہ نہ تراش سکا۔

ایک رات جب رحبانی نے ایمن سے فرمائش کی تھی کہ وہ اسے پاکیزہ فلم کے گانے پر رقص کر کے دکھائے تو اس پر ایمن نے انکار کر دیا تھا۔

''میں ابھی رقص نہیں کر سکتی ہوں رحبانی......'' ایمن نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

رحبانی اس کی شکل دیکھنے لگا۔

ایمن تو اسے کسی بات پر انکار نہیں کیا کرتی تھی۔ وہ تو اس کے ایک اشارے کی منتظر رہا کرتی تھی۔

"کیوں......؟ کیا ہوا ہے؟"

"کچھ ایسا جس کے بعد میں ابھی کچھ عرصہ رقص نہیں کر سکوں گی۔" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

رحبانی پھر بھی کچھ نہیں سمجھا۔

"تم باپ بننے والے ہو رحبانی......" بالآخر ایمن نے بتا دیا۔ رحبانی فق صورت لیے اسے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ خوش ہو یا دکھی۔

"کیا ہوا؟ تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" وہ اس کے وجود کے بے حد قریب ہوتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"پتا نہیں...... میں تو یہ بھی بھول گیا ہوں کہ اس طرح کی بات پر کس طرح کا ردعمل دیتے ہیں۔"

"خوش ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی بات نہیں...... میں سمجھ سکتی ہوں کہ تمہارے ذہن سے اپنے ماں باپ اور اپنوں کی بے رحم موت کے منظر اوجھل نہیں ہو پائے ہیں، اس لیے تم ہر نئی بات پر پریشان ہو جاتے ہو۔"

"شاید......"

"تو میں کہہ رہی تھی کہ اب تم باپ بننے والے ہو تو ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔ مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا...... لیکن کل کو لوگ تمہارے بچے کو ناجائز کہہ دیں گے تو یہ بات تمہیں برداشت نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم شادی کر لیں۔"

"ٹھیک ہے...... اس جمعے کو ہمارا نکاح ہے۔ روشن بیگم کو بتا دینا۔" گہرا سانس بھرنے کے بعد رحبانی نے کہا تھا۔

دین حویلی میں یہ بات بہت خاموشی سے گردش کر گئی تھی کہ جمعے والے دن رحبانی کا ایمن سے نکاح ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جس پر حیران ہوا جاتا...... تہمینہ پھپھو تو ویسے بھی رحبانی کو کتنی بار

کہہ چکی تھیں کہ وہ ایمن سے ہی شادی کر کے اپنا گھر بسا لے۔ جس پر رجبانی ہر بار انہیں ٹال جایا کرتا تھا۔ اور اب خود سے اس نے کہہ دیا تھا کہ جمعے والے دن اس کا ایمن سے نکاح ہے۔ اس خبر کے ساتھ ایک اور خبر بھی حویلی میں گردش کر گئی تھی جو حویلی کے مکینوں کو زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔ وہ یہ کہ ایمن ماں بننے والی ہے۔ سب منہ بنا کر رہ گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ رجبانی کو اس بات پر بول نہیں سکتے تھے۔ ڈانٹ پھٹکار نہیں سکتے تھے۔ اس لیے سب نے جو جیسا ہو رہا ہے ہونے دو کی بنیاد پر قبول کر لیا تھا۔

حویلی کا ماحول بھی ایسا نہیں رہا تھا کہ رجبانی کی شادی کے حوالے سے خوش ہوا جا سکتا یا اس تقریب کے حوالے سے بڑھ چڑھ کر تیاری کی جا سکتی۔ رجبانی کی خوشی میں شریک ہونے کے حوالے سے سب کو چاند کی ناراضی کا بھی ڈر تھا۔ اس لیے جو کچھ ہو رہا تھا بہت خاموشی اور رازداری میں ہو رہا تھا۔ ایسے جیسے کسی کے گھر چوری کرنے کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہو۔

سلمان سے کہہ کر رجبانی کا کمرا تیار کروا دیا گیا تھا۔ اور ایمن کے کچھ کپڑے حاجی بوا نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیے تھے۔ پھلوں اور مٹھائی کی ٹوکریاں بھی انہوں نے اکیلے ہی تیار کی تھیں۔ جو بھی تھا وہ اس شادی کے حوالے سے بہت خوش تھیں اور اپنی خوشی ان سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

رجبانی کے گھر بہت جلد بچہ ہونے والا تھا یہ بات ان کے لیے مزید مسرت کا باعث بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ شادی سے فارغ ہوتے ہی وہ ہونے والے بچے کی تیاری کرنا شروع کر دیں گی۔ سویٹر، ٹوپی، موزے...... نجانے کیا کچھ تو بننے والا تھا۔ وہ تو ابھی سے بازار آتے جاتے ہونے والے بچے کی چیزیں اٹھا کر دیکھنے لگی تھیں۔ سنار کو سونے کی ننھی انگوٹھی اور بڑھئی کو رانگلے پنگوڑے اور جھولے کا انہوں نے پیشگی ہی کہہ دیا ہوا تھا۔ اپنے ہی خیالوں میں وہ خود کو ہونے والے بچے کی دادی تصور کیے ہوئے تھیں۔

چاند نے کرم نوازی کرتے ہوئے ان کے تصورات میں کسی طرح کا کوئی خلل نہیں ڈالا تھا۔

بستامی، کومل، حاجی بوا اور سلمان...... یہ چار افراد رحبانی کے ساتھ بارات کے طور پر گئے تھے۔ باقی کسی نے بارات کے ساتھ جانا مناسب نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی رحبانی نے کسی کو اس چیز کی دعوت دی تھی۔ جتنی خاموشی سے یہ قافلہ حویلی سے گیا تھا، اتنی ہی خاموشی سے ان سب کی واپسی ہوئی تھی۔

سب سارا دن کمروں سے باہر نکلے ہی نہیں تھے، جو ان کی واپسی پر کہیں چھپتے۔ حاجی بوا نے دروازہ کھولا تو سامنے ساری حویلی ایسی خاموش تھی جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ نئی دلہن کا استقبال کرنے کے لیے وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ ان کے دل کی کھال سکڑی تھی لیکن پھر انہوں نے ہمیشہ کی طرح بہت جلد خود کو سنبھال لیا تھا۔

"پہلے میں دہلیز میں تیل گرالوں۔ پھر نئی دلہن کو اندر لانا۔" حاجی بوا نے کہا اور جلدی سے اندر جا کر تیل کی بوتل لے آئی تھیں۔ دروازے کے دونوں اطراف تیل گراتے ہوئے وہ بے حد خوشی محسوس کر رہی تھیں۔ جیسے اپنا سگا بیٹا بیاہ کر لا رہی ہوں۔

"اب تم اندر آسکتی ہو ایمن......"

"یہاں ہی رک جاؤ...... ایک قدم آگے مت بڑھانا۔" چاند وہاں آئی تھی اور اس نے سخت لہجے میں ایمن سے کہا۔ گھونگٹ نکالا سر اٹھا کر ایمن چاند کو دیکھنے لگی۔ سلمان تو ملازم ہونے کی حیثیت سے ایک طرف چلا گیا تھا اور کومل کھا جانے والی نظروں سے چاند کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے چاند......؟" حاجی بوا نے نرمی سے پوچھا۔

"یہ لڑکی اس حویلی میں داخل نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں...... کیوں داخل نہیں ہو سکتی ہے؟" کومل بھڑکی۔

"کس حیثیت سے اندر آ رہی ہے یہ؟"

''یہ اب رحبانی کی بیوی ہے۔'' کومل نے کچھ جتاتے ہوئے کہا۔

''تو......؟ رحبانی تو اس گھر کا ملازم ہے۔ جو اب اپنی اوقات بھول بیٹھا ہے۔ رحبانی اس حویلی کا کچھ نہیں لگتا تو اس کی بیوی کیسے لگے گی۔''

رحبانی نے دکھ سے چاند کو دیکھا۔ اتنی تلخ بات سن کر حاجی بوا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ چاند بے شک سچ بات کہہ رہی تھی لیکن وہ آج کے دن تو صبر کر لیتی......آج تو رحبانی کی شادی کا دن تھا۔

''اس حویلی میں رحبانی کا کچھ نہیں ہے۔ یہ اپنی بیوی کو یہاں نہیں رکھ سکتا ہے۔'' چاند نے دو ٹوک کہہ دیا۔

''یہ حویلی بستامی کی بھی ہے۔'' کومل نے جیسے یاد دلایا تھا۔

''تب ہی تو تم یہاں رہ رہی ہو۔ لیکن ایمن......اس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں بنتی۔''

''یہ سب پھر کسی دن کر لینا چاند......تم دیکھ نہیں رہی کہ اس کی آج شادی ہے۔'' بستامی نے بھی منت بھرے انداز میں کہا۔

چاند نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ زندگی بھر بستامی کی شکل نہ دیکھنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

''مجھے میرے باپ سے ایک ہی شکوہ رہے گا رحبانی......کہ وہ مردم شناس نہیں تھا، ورنہ تجھ جیسے رزیل کو ضرور پہچان جاتا۔'' چاند نے نفرت سے کہا۔

رحبانی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''کل وکیل کو بلا کر حویلی کے حصے کروا لیتے ہیں۔ حاجی بوا، آپ ایمن کو اس کے کمرے میں لے جائیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ایمن اندر جا سکتی ہے۔ لیکن پہلے اس کو پاک کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے

پیٹ میں ایک ناجائز بچہ ہے۔ اس کے سارے بال اتار کر اس کو پاک کرنا ضروری ہے۔ کیوں رحبانی؟'' چاند نے طنزیہ پوچھا۔

چاند کی یہ بات ایمن کے دل میں برچھی کی طرح اتر گئی تھی۔ جو اس نے بستامی سے صندل کے حوالے سے کہا تھا وہی چاند اس کے حوالے سے کہہ رہی تھی۔ قدرت بہت جلد ہی اسے اس کے بنائے ہوئے گڑھے کے دہانے تک لے آئی تھی۔

''تم مجھے کہیں اور لے کر جا سکتے ہو رحبانی؟'' ایمن نے نم آنکھوں کے ساتھ رحبانی سے پوچھا۔ رحبانی نے چاند کو دیکھا۔ جس کے دل میں کوئی رحم نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر جیسے اسے ادراک ہوا کہ یہ فیصلہ کرنے کی گھڑی ہے۔ بلکہ ویسا ہی فیصلہ جیسا اس نے ہندوستان سے ہجرت کرتے وقت کیا تھا۔

''حاجی بوا! میرے کمرے سے میرا سامان لا دیں۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔'' رحبانی نے حاجی بوا سے کہا۔

''کیا بات کر رہے ہو تم رحبانی...... یہ عورت تو پاگل ہو گئی ہے۔ اس کی بات کو سنجیدگی سے لے رہے ہو۔'' کومل چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھڑکی۔

''نہیں...... چاند نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ اس حویلی میں میرا کچھ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اب میں اپنی زمین پر کھڑا ہونا سیکھوں۔''

''لیکن......'' بستامی نے کچھ کہنا چاہا مگر رحبانی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔

''کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں اب یہاں سے جا رہا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے۔ حاجی بوا! میرا سامان لے آئیں۔'' رحبانی نے حاجی بوا سے کہا۔

حاجی بوا پہلے تو چند لمحے چاند کو دیکھتی رہیں۔ پھر چار و ناچار بھیگی آنکھوں سے رحبانی کے کمرے

کی طرف جانے لگیں۔

''آپ کو بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے حاجی بوا...... رحبانی کے ساتھ آپ بھی جانا چاہتی ہیں تو شوق سے جا سکتی ہیں۔ میں آپ کے فیصلے کو قبول کروں گی۔''

چاند نے پیچھے سے کہا اور چاند کی بات سن کر حاجی بوا کی آنکھیں جیسے پتھر کی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر چاند کو دیکھنا چاہا لیکن پھر انہیں لگا کہ کسی کو اپنا شکستہ وجود دکھانا بھی ٹھیک نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے وہ رحبانی کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

چاند بھی ایک غلط نظر رحبانی پر ڈال کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس دن کی شام میں نوکیلے پنجے تھے جو دن کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ چاند تیکھا ہوا سورج کو تیورا کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے اب مدتوں اس کا راج چلنے والا ہو۔ دور بنسواڑی علاقے سے باسی بنسلوچن کی بدبو حویلی پر چھانے لگی تھی۔

حاجی بوا رحبانی کا سارا سامان سمیٹ کر دروازے تک چلی آئی تھیں۔ انہوں نے سامان میں رحبانی کی سنکھ بھی رکھ دی تھی۔ اور ایمن کے نئے جوڑے بھی......

گھر کے باقی مکین اپنے اپنے کمروں کی کھڑکیوں میں کھڑے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے اور وقتی طور پر اداس ہو گئے تھے۔ رحبانی اور ان کا ساتھ ایک عرصے کا تھا۔ اور اب وہ بنا ملے ہی یہاں سے جا رہا تھا۔

''تم نے ایسے ہی اس عورت کی باتوں کو سنجیدگی سے لیا۔'' کومل نے رحبانی کو اسلام آباد والے گھر کی چابی پکڑاتے ہوئے کہا۔

''شاید اب اس کی باتوں کو سنجیدگی سے لینے کا وقت آ گیا۔ میں کب تک خود کو دھوکا دیتا رہوں گا۔'' رحبانی نے سامان پکڑ لیا اور چابی بھی...... پھر وہ بستامی سے گلے ملا اور حاجی بوا کو اس نے اپنے سینے سے لگا لیا۔ حاجی بوا بے قرار ہو کر رونے لگیں۔ دونوں ہی نجانے کتنی دیر تک روتے رہے تھے۔

''چلتا ہوں اب......'' آنسو صاف کرتے ہوئے رحمانی نے سب سے کہا اور پھر ایمن کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی دہلیز پار کر گیا۔

حاجی بوا سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ انہیں لگا ان کا قافلہ لوٹ لیا گیا ہے اور وہ لق ودق صحرا میں بے یارو مددگار کھڑی ہیں۔



حویلی کا بٹوارا نہیں ہو سکا تھا۔ جبکہ وکیل کو بلا کر پیمائش تو کر لی گئی تھی کہ حویلی اور باغ میں سے کتنی کتنی اراضی چاند کے حصے میں آتی ہے۔ باغ میں تو بستامی اور چاند دونوں کا حصہ آدھا آدھا تھا لیکن حویلی میں بستامی کا حصہ زیادہ تھا۔ بستامی لڑکا تھا۔ ظاہر ہے کہ ترکے میں اس کا زیادہ حصہ نکلتا تھا۔ دروازے سے حویلی کے آخر تک بستامی کے حصے کی جو پیمائش کی گئی تھی اس لائن کو دیکھتے ہوئے کومل سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ اس کا حویلیاں میں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اسلام آباد شفٹ ہونا چاہتی تھی۔ اور حویلی کے درمیان سے دیوار اٹھا کر اسے بیچنا سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ ان کے ہاتھ وہ رقم نہیں آسکتی تھی جو وہ سوچ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر بٹوارے کے بعد حویلی کا بکنا بھی مشکل تھا۔ اور چاند کو ساری حویلی بیچنے پر راضی کرنا ناممکن تھا۔

کومل اسلام آباد میں بڑا سا گھر خریدنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے لیے اسے بڑی رقم درکار تھی جو اکٹھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ دراصل اس کی خواہش کہیں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پہلے وہ جو گھر پسند کر چکی تھی اب اس سے بھی بڑا چاہتی تھی۔ پہلے اسے سوئمنگ پول والا گھر چاہیے تھا، اب اسے لان اور سرونٹ کوارٹر والا گھر درکار تھا۔ اس کی خواہشات کا سلسلہ تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔ دوسرا چاند نے الگ مسئلے پیدا کر دیے تھے۔

''میں اب مزید اڈے کے کام میں ساتھ نہیں دے سکتی ہوں۔ بستامی اس کام کو جاری رکھنا چاہتا ہے تو وہ اس کی مرضی......''

چاند نے دوٹوک کہہ دیا تھا۔ جس سے وقتی طور پر کومل کا سر چکرا کر رہ گیا تھا۔ رحبانی گھر چھوڑ کر جا چکا تھا اور بستامی کو اڈے کے کام کی زیادہ جان کاری نہیں تھی۔ وہ تو بس منڈی میں مال بیچنے جایا کرتا تھا۔ گھر پر ملازموں سے چاند ہی کام لیا کرتی تھی اور کس تہوار پر کیسے رنگوں کے لباس تیار ہوں گے یہ سب چاند کو ہی معلوم تھا۔ کومل نے خود کو بھی لعنت ملامت کی تھی کہ جب چاند اسے یہ سب بتا رہی تھی تو وہ کیوں نہیں یہ سب سیکھ سکی تھی۔

''چاند نے کام میں ساتھ دینے سے منع کر دیا ہے۔'' کومل نے چاند کا پیغام بستامی کو دے دیا تھا۔ بستامی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ کومل سمجھ گئی تھی کہ اب جلد ہی یہ کام بند ہو جائے گا۔

چاند نے رسوئی الگ کر لی تھی۔ اس کا اور پھوپھیوں سمیت ان کی بیٹیوں کا کھانا الگ بننے لگا تھا۔ کومل کو اپنے کھانے کے لیے الگ سے ملازمہ رکھنا پڑی تھی۔ جس کے باعث خرچے کم ہونے کے بجائے دن بدن بڑھنے لگے تھے۔ اور اسے تو مزید پیسہ درکار تھا۔

کومل نے تہمینہ پھپھو کی چھوٹی بیٹی روشانے کی بات کی ہوئی تھی کراچی کے ایک تاجر سے...... جس نے تصویر دیکھ کر روشانے کو پسند کر لیا تھا اور بدلے میں ایک بڑی رقم دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ اب کومل چاہتی تھی کہ روشانے جلد سے جلد کراچی چلی جائے اور اس کی رقم انہیں مل جائے۔ دونوں نے مل کر وہی سب کرنے کا سوچا ہوا تھا جو وہ تعبیر کی باری کر چکے تھے۔ جھوٹے نکاح کا ڈرامہ کرنا تھا اور روشانے نے رخصت ہو کر ہمیشہ کے لیے کراچی چلے جانا تھا۔

حاجی بوا کے ذریعے گھر میں روشانے کے لیے آئے رشتے کی بابت سب کو معلوم ہوا تھا اور جب سب کو یہ معلوم ہوا کہ یہ رشتہ کومل کے توسط سے آیا ہے تو سب نے رشتے کو بنا دیکھے ہی انکار کر دیا تھا۔

''تم سے کتنی بار کہا ہے کہ ہمارے بارے میں مت سوچو...... ہم اپنی بچیوں کی شادیاں خود

کر سکتے ہیں۔ تم اپنا خاندان بناؤ اور پھر اپنے بچوں کی فکر کرو۔ دوبارہ گھر کی کسی لڑکی کے لیے پریشان ہونے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔" چاند نے سخت انداز میں کومل سے کہا۔ کومل تو چاند کی شکل ہی دیکھتی رہ گئی تھی۔

"لیکن رشتہ بہت اچھا ہے۔"

"ہمیں تمہارے یا بستامی کے توسط سے آیا کوئی رشتہ قبول نہیں ہے کومل...... بہتر ہے کہ تم ہمارے معاملات میں مت پڑو۔"

تہمینہ پھپھو نے بھی کہہ دیا تھا لیکن کومل اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے روشانے سے نجانے کیا بات کی تھی کہ وہ چاند امی اور اپنی سگی ماں کے روبرو آکھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے کومل آنٹی کا لایا رشتہ منظور ہے۔" بڑے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے جیسے سب سے کہا تھا۔ کرن اور زارا کے علاوہ سب نے ہی غصے سے روشانے کو دیکھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو کہ ہم تمہارے بارے میں کومل سے بہتر نہیں سوچ سکتے ہیں۔" چاند نے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں...... لیکن ان کے لائے رشتے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لڑکا کراچی سے ہے اور میں تو ویسے بھی اس چھوٹے شہر سے نکل کر کسی بڑے شہر جانا چاہتی ہوں۔ اس چھوٹے شہر نے ہم سب کو تنگ نظر بنا دیا ہے۔" روشانے نے کہا تو چاند اور تینوں پھپھیوں کو حیرت ہوئی۔ روشانے کومل کی زبان بول رہی تھی۔

"تمہارے بڑے تمہارا بہتر سوچ رہے ہیں روشانے......"

"بڑوں نے تو اپنی زندگی کے فیصلے درست نہیں کیے، پھر وہ میرا بہتر کیسے سوچ سکتے ہیں؟" روشانے نے یہ سب کچھ ایسے انداز میں کہا کہ چاند کو اس بات میں طنز ہی طنز محسوس ہوا تھا۔ حیرت سے چاند کی آنکھیں پھیلتی چلی گئی تھیں۔

"کیا کہنا چاہتی ہو تم روشانے......" چاند نے پوچھا تو غصے سے بھری روشانے نے سیدھی سیدھی

سنانے میں بالکل دیر نہیں کی۔

"صرف میں ہی نہیں...... سارا حویلیاں کہہ رہا ہے کہ چاند نے شادی نہ کر کے حویلی کو برباد کر دیا ہے۔ دین بابا کی موت ہو گئی اور ان کی موت کے بعد حویلی کے لڑکے بے راہ روی کا شکار ہو گئے۔" روشانے نے چاند کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

تہمینہ پھپھو نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ روشانے کے منہ پر دے مارا تھا۔

"بدتمیز لڑکی...... بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تجھے......"

"کیا کرتی ہو تہمینہ...... جوان لڑکی پر ہاتھ اٹھاتی ہو۔" زہرہ پھپھو نے آگے بڑھ کر بہن کو روکا۔

"معافی مانگو چاند سے......" تہمینہ پھپھو غصے سے بولیں۔

"میں نے کچھ غلط نہیں کہا جس کی معافی مانگوں۔ اس بوسیدہ حویلی کے بند دروازوں سے باہر نکل کر دیکھیں، زمانہ یہ ہی باتیں کر رہا ہے۔ آپ سب ہمیں بھی اپنے جیسا بنانا چاہتی ہیں۔ جوانی میں بڑھاپے کا شکار خواتین......" روشانے غصے سے بولتی چلی گئی۔

"آنکھوں کی شرم بیچ کھائی ہے کیا...... کہاں سے سیکھا ہے یہ سب...... اس چھنال کومل سے......"

"جسے آپ چھنال کہہ رہی ہیں اسے آپ سب ہی بیاہ کر لائی ہیں۔ میں نہیں...... پھر اب اس سے اتنی نفرت کیوں......؟" اس نے سب کو لاجواب کیا۔ "ٹھیک ہے مت کریں میری وہاں شادی جہاں کومل آنٹی کہہ رہی ہیں لیکن پھر مجھے حویلیاں میں بھی شادی نہیں کرنا ہے۔ مجھے اس چھوٹے شہر میں کنویں کا مینڈک بن کر نہیں جینا ہے۔"

روشانے بلند آواز سے کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ کرن اور زارا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے گھر کی خواتین کے حوالے سے منہ بنایا۔ انہیں روشانے کی بات کہیں سے بھی غلط

نہیں لگ رہی تھی۔ تہمینہ پھپھو چاند کے قریب ہوئیں۔

''روشانے کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں چاند...... نجانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کومل نے کیا پٹی پڑھائی ہے اسے۔''

''کوئی بات نہیں پھپھو...... بچی ہے، سمجھ جائے گی۔'' آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتے ہوئے چاند بھی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

۲۰۰۳ء

ہوٹل کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ضامن جھٹکے سے بیڈ سے اترا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ باہر کون ہو گا۔ اسے کب سے ہی تو انتظار تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھولا تھا۔ حسب توقع سامنے خیام کھڑا تھا۔ جو دروازہ کھلنے کے بعد اندر داخل ہو گیا تھا۔

''کیا وہ آرہی ہے؟'' دروازہ بند کرنے کے بعد اور خیام کے بولنے کا لمحہ بھر انتظار کرنے کے بعد ضامن نے بے قراری سے پوچھا۔ ''کیا تو نے اسے مجھے معاف کرنے پر راضی کر لیا ہے؟''

''ہاں......!'' خیام نے آہستگی سے کہا۔ ضامن کو چند لمحے خیام کے جواب پر یقین ہی نہیں آیا۔

''کیا سچ میں؟''

''ہاں...... میں نے اسے تجھے معاف کرنے کے لیے راضی کر لیا ہے۔ وہ تجھے معاف کرنے کے لیے مان گئی ہے۔''

''کیا وہ تیرے ساتھ آئی ہے؟''

''نہیں...... میں اسے کل لاؤں گا۔''

''کل کیوں...... وہ راضی ہو گئی ہے تو تو اسے آج ہی لے آتا...... اگر وہ رات ہی رات میں گھر

چھوڑ کر چلی گئی تو...... ہو سکتا ہے کہ اس نے تجھ سے جھوٹ کہا ہو کہ وہ مجھے معاف کرنے کے لیے تیار ہے۔اس کا ارادہ تجھے ٹالنے کا ہو۔اور کل وہ تجھے اور شائستہ آنٹی کو بتائے بنا کہیں اور چلی جائے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا ضامن...... اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہیں معاف کر دے گی۔"

خیام نے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

ضامن کو اس کے جواب سے تسلی ملی تھی۔ چند لمحے تو اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیسا ردعمل دے، پھر اس نے آگے بڑھ کر خیام کو گلے سے لگا لیا۔

"تو...... تو بہت اچھا ہے خیام...... سچ میں، تو نے میرے لیے یہ مشکل کام کیا۔"

"ظاہر ہے۔تو میرا دوست جو ہے۔" خیام نے اس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"میں کل ہی باریشہ کو پرپوز کر دوں گا۔" ضامن نے کہا۔

خیام کو ایسے لگا کہ جیسے ہوٹل میں کوئی دھماکا ہو گیا ہو۔اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔اس نے جھٹکے سے ضامن کو خود سے الگ کیا۔

"کیا......؟ کیا کہا تو نے......؟"

"میں باریشہ کو پرپوز کر دوں گا۔"

"اس بات کا مطلب؟"

"اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے۔تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ باریشہ مجھے چاہتی ہے۔"

"ہاں...... لیکن تو نے کہا تھا کہ یہ باریشہ کا مسئلہ ہے۔تو باریشہ سے محبت نہیں کرتا ہے۔"

"کہا تھا، ایسا ہی کہا تھا۔لیکن اب...... وقت بدل گیا ہے۔ مجھے باریشہ سے محبت ہو گئی ہے۔"

ضامن نے بتایا اور ہوٹل کا کمرا خیام کے پیروں تلے سرکنے لگا۔

ہنگامی سائرن کی آواز اسے اپنے کانوں میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔اسے لگا کہ اس کے

کان پھٹ جائیں گے یا اس کا دماغ......

''لیکن ضامن......!''

''پچھتاوے کے ان دنوں میں میں اسے چاہنے لگا ہوں۔ وہ مجھے معاف کر دے گی تو پھر میری محبت کو قبول کرنا اس کے لیے مشکل نہیں رہے گا۔ جن سے محبت ہو ان سے نفرت نہیں کی جا سکتی۔ وہ مجھے چاہتی ہے۔ وہ جلد ہی میرے گناہ کو بھلا دے گی۔'' ضامن کہتا جا رہا تھا اور خیام اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

☆......☆......☆

بارہ کہو کے علاقے میں رات کی خنکی کے ساتھ ساتھ جیسے برف بھی اتر رہی تھی۔ جو سارے بارہ کہو پر چھاتی جا رہی تھی۔ ہر چیز سفید اور منجمد ہونے لگی تھی۔ پھول حنوط ہو چکے تھے۔ درخت بے دم کھڑے تھے اور گھاس پر مردنی چھا چکی تھی۔ خیام نے تاریک رات میں چاند کو دیکھا۔ اسے چاند ٹوٹ کر بکھرتا ہوا محسوس ہوا۔ جو شاید اس کی اپنی حالت تھی۔ وہ کبھی بھی دوستی میں محبت کو نہیں لانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ایک قدم بہت احتیاط سے رکھا، سنبھل سنبھل کر محبت کا یہ سفر شروع کیا تھا۔ پھر بھی اس کی راہ میں کانٹے کیوں اگنے لگے تھے۔ وہ باریشہ کو چاہتا تھا اور اب ضامن کہنے لگا تھا کہ وہ بھی باریشہ کو چاہنے لگا ہے۔ کیا یہ قدرت کی اس کے ساتھ ناانصافی نہیں تھی۔

''کیا ہوا......لگتا ہے کہ کسی گہری سوچ میں گم ہو۔'' باریشہ وہاں آئی تو اس نے خیام سے پوچھا جو آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ آواز پر خیام نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

''گہری نہیں بلکہ پریشان کر دینے والی سوچ میں گم ہوں۔''

''کس بات پر پریشان ہو تم خیام......؟''

''شاید مجھ سے بتایا نہ جا سکے۔''

''مجھ سے محبت کا اظہار کر دینے کے بعد بھی مجھ سے باتیں چھپاؤ گے؟'' باریشہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

خیام نے گہرا سانس بھرا۔اس کے پاس باریشہ کو بتانے کے لیے جو باتیں تھیں وہ باریشہ کو بھی پریشان کر سکتی تھیں۔

''میں آج ضامن سے ملنے گیا تھا۔''

''تو......؟''

''میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تم اسے معاف کرنے پر راضی ہو گئی ہو۔''

''اس میں پریشانی والی کیا بات ہے؟''

''ضامن نے کہا ہے کہ وہ تمہیں پروپوز کرے گا۔''

خیام نے فوراً اسے بتا دیا۔وہ اس بات کو اب مزید اپنے تک نہیں رکھ سکتا تھا۔وہ اپنی پریشانی جلد سے جلد کسی کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔

خیام کی بات سن کر باریشہ کے چہرے پر حیرت آئی تھی۔

''وہ تمہیں چاہنے لگا ہے باریشہ......''

''یہ اب اس کا مسئلہ ہے۔تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟''

''تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو باریشہ...... وہ میرا دوست ہے۔''

''تو تم نے اسے بتا دینا تھا کہ تم مجھ سے محبت کا اظہار کر چکے ہو اور میں نے تمہاری محبت کو قبول کر لیا ہے۔میرے دل میں اب اس کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''میں نہیں بتا سکا۔نجانے کیوں میں نہیں بتا سکا باریشہ......'' خیام بتاتے ہوئے کچھ بے ہمت سا دکھنے لگا تھا۔

"تم اتنے ڈرپوک کیوں ہو خیام......؟"

"نہیں...... میں ڈرپوک نہیں ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میرا دوست پھر سے ڈپریشن میں نہ چلا جائے۔"

"تمہیں دوست کی پروا ہے یا محبت کی......؟" باریشہ کو خیام کی بات بری لگی۔

"میری کنڈیشن سمجھنے کی کوشش کرو باریشہ...... مجھے دورا ہے پر کھڑا مت کرو۔ ضامن دوست ہے میرا...... عزیز ہے مجھے۔ تم بھی عزیز ہو۔ اسی لیے تمہیں اپنی پریشانی بتا رہا ہوں تاکہ تم میری حالت سمجھ کر کچھ حل نکالو۔"

"حل ہے خیام...... اس میں سوچنے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ضامن کو بتا دیتے ہیں کہ میں تمہیں چاہنے لگی ہوں۔ یہ بات ہم چھپا نہیں سکتے ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو اسے معلوم ہونا ہی ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن تو اسے یہ بات معلوم ہونا ہی ہے۔ لیکن...... وہ ڈپریشن سے گزر چکا ہے باریشہ...... مجھے ڈر ہے کہ وہ اپنی ماں کی طرح کا نہ بن جائے۔ تم نہیں جانتیں کہ ان کی کیا حالت ہو جایا کرتی تھی۔"

"تو......؟ تم کیا چاہتے ہو خیام...... کہ ہم ساری زندگی ضامن سے اس بات کو چھپائے رکھیں۔"

"ہم اسے بتا دیں گے۔ لیکن ابھی نہیں...... تھوڑے عرصے کے بعد...... تم اس کے سامنے کچھ ظاہر مت کرنا۔ اگر وہ تمہیں پروپوز کرے تو تم اس سے سوچنے کے لیے وقت مانگ لینا۔ تم اسے مت بتانا کہ تم میرے ساتھ زندگی گزارنے کا تہیہ کر چکی ہو۔"

"نہیں خیام...... یہ ڈرامہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ میرے نزدیک اس ڈرامے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔" باریشہ نے فوراً اسے انکار کر دیا۔

"تم زویا آنٹی سے ملی ہوتیں تو ایسی بات نہ کرتیں...... وہ ساری زندگی ڈپریشن میں رہی ہیں۔ ضامن ان کی طرح کا ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا۔ تم اسے معاف کرنے پر تیار ہو گئی ہو تو میری بات

مانتے میں کیا برائی ہے۔ صرف تھوڑے عرصے کی بات ہے۔"

"یہ غیر ضروری ہے۔ اگر ضامن اپنی ماں کی طرح کا ہو جاتا ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔"

"اتنی سنگ دلی کا مظاہرہ نہ کرو باریشہ...... تمہارا اور ضامن کا خون کا رشتہ ہے۔ وہ تمہاری پھپھو کا بیٹا ہے۔" خیام نے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا اور باریشہ کے چہرے پر حیرت سی پھیلتی چلی گئی تھی۔

اسے جیسے ابھی، اسی لمحے ادراک ہوا تھا کہ ضامن اس کے باپ کا رشتے دار ہے۔ اور اس کا ضامن کے ساتھ خونی رشتہ ہے۔



ہوٹل کی عمارت کے وسط میں نصب فوارا عمارت کی بلندی کو چھو رہا تھا۔ پانی کی دھار ہوا کی طاقت کے بل پر اونچی اڑان بھرے ہوئے تھی۔ جس کی بوچھاڑ نے دائیں بائیں کی ہوا میں نمی بھر دی تھی۔ باریشہ کو وہ نمی اپنے چہرے پر پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ مصنوعی بارش تھی جس سے وہ لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ہوٹل کے اس حصے میں کوئی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ موسم میں خنکی تھی اور سب اسلام آباد کی سردی میں احتیاط سے چلنے کے عادی تھے۔

لیکن پچھلے کچھ دنوں سے باریشہ عجیب سی نڈر ہو چکی تھی۔ اسے اس بات کی بھی کوئی پروا نہیں رہی تھی کہ کوئی اسے دیکھ لے گا اور لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ باریشہ مری نہیں بلکہ زندہ ہے۔ وہ کچھ بے پروا ہو کر جینے کی عادی ہونا چاہتی تھی۔

"باریشہ......!" اپنے پیچھے اسے ضامن کی آواز سنائی دی تھی۔ باریشہ نے رخ بدلنے سے پہلے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجانے کی کوشش کی تھی۔ پھر رخ بدل کر ضامن کی طرف دیکھا۔ باریشہ کے چہرے پر نارمل تاثرات دیکھ کر ضامن کو بھی تسلی ہوئی تھی۔

"کیسی ہو باریشہ......؟"

"ٹھیک ہوں۔تم کیسے ہو ضامن......؟" وہ حد درجہ نارمل لہجہ رکھتے ہوئے بولی۔

"تم نے حال پوچھ لیا میرے لیے یہ ہی بہت ہے۔" ضامن نے کہا۔ باریشہ نے پھیکی سی اسمائل پاس کی۔

"تمہارا شکریہ کہ تم نے خیام کی بات مان لی اور مجھے معاف کرنے پر تیار ہو گئیں۔ یہ یقیناً تمہارے لیے مشکل رہا ہو گا۔"

"ہاں...... بہت...... اپنے قاتل کو معاف کر دینا آسان نہیں ہوتا ضامن...... جس نے آپ کی سانسوں کا تو قتل کیا ہی ہو، ساتھ میں آپ کی محبت کا قتل بھی کیا ہو۔"

"مجھے جو کچھ معلوم تھا اس کے نتیجے میں یہ سب ہوا ہے باریشہ...... نجانے تمہارے پاس کیا معلومات ہیں۔لیکن...... میری ماں نے اپنے بھائی کی وجہ سے زندگی ایک اذیت میں گزاری ہے۔"

"زندگی کچھ آسان تو میرے اپنوں کے لیے بھی نہیں رہی ضامن...... لیکن تمہاری ماں کی اذیت بھری زندگی کا بدلہ موت ہر گز نہیں تھا ضامن......" باریشہ نے کہا۔

ضامن نے سر جھکا لیا تھا۔ شرمندگی کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ باریشہ نے گہرا سانس لیا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ خود کو بہت بار کہہ چکی تھی کہ اس نے ضامن کو ملامت کرنے والی کوئی بات نہیں کرنا ہے۔ جب وہ ضامن کو معاف کرنے پر تیار ہو ہی گئی تھی تو پھر کیا ضرورت تھی ان شکوؤں کی...... ان سب کی وضاحتیں اب بے معنی تھیں۔

"خیر چھوڑو...... تم بتاؤ...... کیا اب تم پرسکون ہو؟ خیام تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہو جاتا ہے۔"

"ہاں...... اب میں پرسکون ہوں۔ یہ جان کر کے تمہارے دل میں میرے لیے کوئی نفرت نہیں ہے۔"

"ہاں...... کوئی نفرت نہیں ہے۔"

"اور محبت...... کیا وہ ہے؟" اس نے براہ راست باریشہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

صورت حال متوقع ہونے کے باوجود بھی باریشہ گھبرا گئی تھی۔ ضامن نے خود ہی اپنی بات جاری رکھی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ بدلے کی آگ میں میں نے تمہاری محبت کو نظر انداز کیا باریشہ...... اس کے لیے میں خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔ لیکن اب نہیں کروں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔''

''ضامن......!'' باریشہ نے تھوک نگلا۔ وہ ضامن کو ایک دم سے ساری حقیقت بتا دینا چاہتی تھی لیکن خیام سے کیے ہوئے وعدے کی وجہ سے خاموش رہی تھی۔

''بولو باریشہ...... کیا کہنا چاہتی ہو تم...... کیا تم نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا ہے؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔ لیکن شاید مجھے اپنے دل کو صاف کرنے میں کچھ وقت لگ جائے۔ حالات اب بدل چکے ہیں۔ تم سمجھ سکتے ہو۔''

''ہاں...... یہ تو ہے۔ حالات اب بدل چکے ہیں۔ انہیں واپس پھر سے اپنی ڈگر پر آنے میں کچھ وقت لگے گا اور میں تب تک انتظار کر سکتا ہوں باریشہ......''

''ہاں...... تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔'' باریشہ نے کہا اور پھر بلاوجہ ہی رخ بدل کر فوارے کی اونچائی کو دیکھنے لگی۔ پانی کی ننھی ننھی بوندوں کی طرح وہ بھی ہوا میں تحلیل ہو جانا چاہتی تھی۔



سارہ کو بستامی کے گھر میں رہتے ہوئے کافی دن ہو چکے تھے۔ چند دنوں میں ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس گھر میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ وہ گھر نہیں تھا بلکہ جدید طرز کا چکلہ تھا۔ جہاں نجانے کہاں کہاں سے لڑکیوں کو لایا جاتا تھا اور پھر ان سے اپنی مرضی کا کام لیا جاتا تھا۔ گھر میں بیک وقت دس بیس لڑکیاں موجود ہوتی تھیں۔ کومل ان کی نائیکہ تھی۔ روشن بیگم کے مرنے کے بعد اس نے یہ کام سنبھالا ہوا تھا۔ بستامی دلال بنا ہوا تھا اور رحبانی...... وہ ٹاٹ کا پیوند...... وہ ابھی تک اپنی الگ کوئی حیثیت نہیں بنا سکا

تھا۔وہ اپنے دوست بستامی کے جرموں میں شریک تھا۔

سارہ کے ذمے ایمن کے ذاتی کام تھے، جنہیں کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا کرتا تھا۔اس کے بعد سارہ اپنے مشن پر گامزن ہو جاتی تھی۔ بہت جلد ہی اس نے گھر کے ایک ایک کمرے سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ وہ گھر کا کونا کونا جاننے لگی تھی۔ وہ یہاں اپنی گم شدہ کزنوں کو ڈھونڈنے کے لیے آئی تھی۔ افشیں کو، زارا، کرن اور روشانے کو...... لیکن فی الحال اسے کسی کی کوئی خبر نہیں مل سکی تھی۔ اس نے کومل کے کمرے کی تلاشی بھی لے لی تھی۔ وہاں سے اسے اپنی کزنز تک رسائی کا کوئی سنگ میل نہیں مل سکا تھا۔لیکن سارہ اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اگر اس کی کزنز زندہ تھیں تو اس کے پاس ان تک پہنچنے کے بہت سے طریقے تھے۔اس نے پہلا طریقہ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سارہ نے خالی بوتلیں اکٹھا کرنا شروع کر دی تھیں۔

☆......☆......☆

اسلام آباد سے کراچی کے سفر نے اسے تھکا دیا تھا۔ یہ تھکن سفر سے زیادہ اس تجسس کی تھی جو ضامن نے پیدا کر دیا تھا۔

’’مجھے تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔‘‘

’’کس سے......؟‘‘ باریشہ نے پوچھا۔

’’بس...... سرپرائز سمجھ لو۔‘‘ وہ پیار سے بولا۔

باریشہ ضامن کے ساتھ کراچی جانے پر تیار نہ ہوتی لیکن نجانے کیا بات تھی کہ خیام کے بعد شائستہ آنٹی نے بھی اسے کراچی جانے کو کہا تھا۔ باریشہ نے چار و ناچار رضامندی دے دی تھی۔ سفر کے دوران بھی باریشہ باتوں باتوں میں بہت بار ضامن سے پوچھ چکی تھی کہ وہ اسے کراچی کس سے ملوانے کے لیے لے کر جا رہا ہے لیکن ضامن اپنی بات کا پکا تھا۔اس نے باریشہ کو اشارہ بھی نہیں دیا تھا۔

''میں بس اتنا کہتا ہوں کہ تمہیں میرا سرپرائز اچھا لگے گا۔'' اس نے کہا تھا۔

ایئرپورٹ سے وہ اسے لے کر سیدھا ایک ہسپتال میں داخل ہوا۔

''یہ...... یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو ضامن......؟'' باریشہ نے کچھ حیران ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کے گمان میں کہیں دور دور بھی ہسپتال نہیں تھا۔

''بس تھوڑا انتظار اور...... پھر تمہیں پتا چل جائے گا کہ میں تمہیں یہاں کیوں لے کر آیا ہوں۔''

ضامن نے اس سے کہا۔ پھر وہ استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

ریسپشنسٹ لڑکی نے ایک ملازم سے کہہ کر اسے دو ہاسپٹل گاؤن دیے تھے جنہیں لے کر ضامن باریشہ کے پاس آیا۔

''یہ پہن لو......''

''لیکن کیوں......؟''

''پتا چل جائے گا اب تمہیں......'' ضامن نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔

باریشہ کا اس سے سوال جواب کرنے کا موڈ نہیں تھا۔ اس نے چپ چاپ گاؤن پکڑا اور اپنے لباس کے اوپر پہن لیا۔ ضامن بھی ایسا کر چکا تھا۔ پھر وہ اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں اور تو کوئی موجود نہیں تھا ماسوائے ایک مریض کے جو بیڈ پر لیٹا سو رہا تھا۔ ضامن اس مریض کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ باریشہ بھی اس کے پاس جا کر سو رہے بوڑھے مریض کو دیکھنے لگی تھی۔

''اسے پہچانو باریشہ......!''

''میں اسے کیسے پہچان سکتی ہوں۔ میں اس شخص کو پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔''

''اس کے چہرے میں اپنا چہرہ تلاش کرنے کی کوشش کرو باریشہ......'' ضامن نے کہا۔

باریشہ نے بوڑھے اور کمزور آدمی کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا اور وہاں اپنا چہرہ تلاش کرنے کی

کوشش کی تھی۔ ایک جھما کا ہوا تھا اور ہسپتال کا کمرا باریشہ کو گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ مریض کی شکل میں باریشہ کا چہرہ موجود تھا۔ تڑپ کر اس نے ضامن کو دیکھا تھا۔ ضامن مسکرا رہا تھا۔

"تم نے ٹھیک پہچانا ہے۔ یہ میرزاد ہیں۔ تمہارے باپ......" ضامن نے بہت ہلکے سے دھما کا کر دیا۔

باریشہ تو جیسے سانس لینا ہی بھول گئی تھی۔ بہت سے لمحے تو وہ یقینی اور بے یقینی میں جھولتی رہی اور پھر وہ پھر سے بوڑھے مریض کو دیکھنے لگی تھی جو بہت ہی میٹھی نیند سوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"لیکن کیسے......؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے باپ تو مر چکے ہیں۔"

"نہیں...... تمہارے باپ زندہ ہیں۔ اور کوما میں ہیں۔ تمہاری چاند نانو نے سالوں کے بعد میری ممی سے رابطہ کیا تھا تب ممی نے غصے میں کہہ دیا تھا کہ میرزاد مر چکا ہے۔ ممی سمجھتی تھیں کہ صندل نے میرزاد کو لوٹ کر اس سے طلاق لی ہے۔ اور اب چاند کا میرزاد سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنا بھی اسی لالچ کے تحت ہے کہ وہ میرزاد کی جائیداد میں سے اس کی بیٹی باریشہ کا حصہ چاہتی ہے۔ اور تم یہ ہی سمجھتی رہیں کہ تمہارے باپ مر چکے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ابھی ان کی سانسیں چل رہی ہیں۔"

"یہ...... یہ میرے باپ ہیں۔" باریشہ بیڈ پر بیٹھ گئی اور میرزاد کو دیکھتے ہوئے رونے لگی۔

"مت رو باریشہ...... تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ تمہارا باپ مل گیا ہے۔"

"پتا نہیں یہ خوشی کے آنسو ہیں یا دکھ کے...... میں پہلی بار اپنے باپ کو دیکھ رہی ہوں اور وہ بھی کوما میں......"

"تم اپنے باپ سے باتیں کرو باریشہ...... کہتے ہیں کہ کوما میں گیا انسان لوگوں کی آوازیں سنتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری باتیں سن کر اٹھ جائیں۔"

"نہیں ضامن...... میں نہیں چاہتی کہ یہ اٹھیں۔"

"ایسا کیوں کہہ رہی ہو باریشہ......" ضامن نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

''یہ اٹھیں گے تو میں انہیں کیا بتاؤں گی۔ میرے پاس انہیں بتانے کے لیے کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ جاگ کر یہ پھر سے مر جائیں گے۔ تو بہتر نہیں کہ یہ ایسے ہی رہیں۔''

''ایسا نہیں ہے کہ تمہارے باپ کچھ نہیں جانتے۔ ماموں ایک بار جاگ چکے ہیں۔ انہوں نے صندل سے ملنا چاہا تھا۔ تب ممی نے انہیں بتا دیا تھا کہ صندل کی موت ہو چکی ہے۔ اور تب سے ماموں پھر سے کوما میں ہیں۔''

''کیا تم مجھے کچھ وقت کے لیے یہاں چھوڑ کر جا سکتے ہو ضامن......؟ میں اپنے باپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب تک میرا دل نہیں بھر جاتا۔''

''ہاں...... کیوں نہیں...... جب تم باہر آؤ تو مجھے کال کر دینا...... میں تمہیں لینے آ جاؤں گا۔''

''نہیں...... میں خود ہی ہوٹل تک چلی جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی......'' ضامن کہہ کر وہاں سے باہر چلا گیا تھا۔

باریشہ خاموش نیند سوئے ہوئے اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی اور اپنی آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو بار بار صاف کر رہی تھی۔



''یہ...... یہ کمرہ نمبر تین سے کون باہر نکلا ہے؟'' ہسپتال کی صفائی پر معمور بوڑھی ملازمہ ہانپتی ہوئی ہسپتال کی ریسپشنسٹ لڑکی کے پاس آئی تھی۔

''مریض کو دیکھنے آئے تھے۔ وہی جو عرصے سے کوما میں ہے۔''

''لیکن پہلے تو بس لڑکا آیا کرتا تھا۔ اپنی ماں کے ساتھ...... آج کوئی لڑکی باہر نکلی ہے۔''

''اسی لڑکے کے ساتھ آئی تھی۔''

''نام معلوم ہے اس کا؟''

''نہیں...... نام تو نہیں معلوم......'' ریسپشنسٹ لڑکی نے کہا تو بوڑھی ملازمہ کے چہرے پر مایوسی سی چھا گئی۔

''کیا وہ دوبارہ آئے گی؟'' اس نے ایک امید سے پوچھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی...... آپ کیوں پوچھ رہی ہیں اماں جی......''

''مجھے...... اس لڑکی سے ملنا ہے۔''

''کیوں......؟ کیا ہوا ہے اماں جی......؟''

''بس...... کچھ کہنا ہے اس سے۔''

''شاید اسی لڑکے کے ساتھ دوبارہ آجائے۔ اگر نہیں بھی آئی تو اسی لڑکے سے اس کے بارے میں پوچھ لیجیے گا۔ وہ تو جانتا ہوگا اس لڑکی کے بارے میں...... اسی کے ساتھ تو آج آئی ہے۔''

''ہاں...... ویسے تو میں دھیان رکھوں گی۔ لیکن میں ہسپتال میں کہیں دائیں بائیں ہوئی تو جب بھی یہ لڑکی آئے، مجھے بتا دینا۔''

''ٹھیک ہے، میں دھیان رکھوں گی۔ بلکہ دوسری شفٹ والی لڑکی کو بھی کہہ دوں گی کہ تین نمبر والے مریض کو کوئی لڑکی دیکھنے آئے تو وہ آپ کو بتا دے۔'' ریسپشنسٹ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ملازمہ دل میں امید لیے وہاں سے چل دی تھی۔

''مجھے یقین ہے کہ یہ لڑکی صندل کی بیٹی باریشہ تھی۔'' پرامید ملازمہ نے جیسے خود سے کہا۔

☆......☆......☆

''باریشہ کہاں ہے؟'' زویا نے ضامن کو اکیلا گھر آتے دیکھ کر پوچھا۔ وہ تو اس بات کی آس لگائے ہوئے تھی کہ ضامن اپنے ساتھ باریشہ کو لائے گا۔ دونوں میاں بیوی کب سے بیٹھے باریشہ کا ہی تو انتظار کر رہے تھے۔ زویا نے تو باریشہ کے لیے کھانے میں نجانے کیا کیا کچھ بنوایا ہوا تھا۔ اس کے لیے

کمرا بھی تیار کروا دیا تھا۔ اب ضامن کو اکیلا گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ بے چین ہو گئی تھی۔

"وہ اپنے باپ کے پاس ہے۔ پھر ہوٹل چلی جائے گی۔"

"ہوٹل کیوں؟ تم اسے گھر کیوں نہیں لائے؟"

"اس نے یہاں آنے سے انکار کر دیا۔" ضامن نے صاف لفظوں میں بتا دیا۔

زویا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ضامن کی بات نہیں سمجھی تھی۔ اس کو وضاحت درکار تھی۔

"ممی...... وہ آپ سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتی ہے۔ نجانے اس نے مجھے کیسے معاف کیا ہے۔ وہ آپ سے ملنے کی بالکل بھی چاہت نہیں رکھتی ہے۔" ضامن نے حقیقت بتا دی۔

زویا کو چند لمحے تو ضامن کی بات پر یقین ہی نہیں آیا۔ پھر جب آیا تو وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اتنی نفرت کرتی ہے وہ ہم سب سے......"

"یہ نفرت بہت کم ہے زویا...... جو تم نے کی، ان لوگوں سے......" زوہیب نے جیسے زویا کو یاد کروایا۔ "اپنی انا اور ضد میں تم نے نجانے کتنی غلطیاں کی ہیں۔"

"تم بھی تو میرے ساتھ ہی تھے زوہیب...... تم ہی بتاؤ...... جو کچھ مجھے معلوم ہوا اس میں ان لوگوں سے نفرت کرنا ہی تو بنتی تھی۔"

"جب کمرے میں ہی اندھیرا ہو تو آئینے کے اندھے پن کا شکوہ کیا کرنا...... تمہارا دل پہلے سے ہی ان لوگوں کے لیے نفرت رکھتا تھا۔ پھر جو حالات بنے اس میں تم ان سے محبت کیسے کرتیں۔"

زویا بے آواز رونے لگی۔

"اب رونے کا کوئی فائدہ نہیں ممی...... ہم بیتے کل کو واپس نہیں لا سکتے۔ میں باریشہ سے کہوں گا کہ وہ آپ کو معاف کر دے گی۔ گارنٹی نہیں دے سکتا۔ امید ہی دلا سکتا ہوں کہ وہ آپ کو معاف کر دے گی۔"

☆......☆......☆

یہ کراچی میں اس کی آمد کا دوسرا دن تھا جب وہ پھر سے اپنے باپ کو دیکھنے ہسپتال گئی تھی۔ اس خاموش لیٹے انسان کو جی بھر کر دیکھ لینے اور بے تحاشا رو لینے کے بعد وہ ہاسپٹل گاؤن اتار کر باہر نکل رہی تھی جب کسی نے اسے پکارا۔

''کیسی ہو باریشہ......؟''

باریشہ نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ کوئی بوڑھی خاتون تھی۔ جو شاید ہسپتال کی صفائی پر معمور تھی۔ باریشہ کو کچھ حیرت ہوئی تھی۔ بوڑھی عورت اس کا نام کیسے جانتی تھی جبکہ وہ تو کراچی میں کسی کو نہیں جانتی تھی۔

''جی......میں ٹھیک ہوں۔ آپ کون ہیں؟''

''کیا کرو گی جان کر کہ میں کون ہوں۔ میں تو عرصے سے خود کو چھپائے ہوئے ہوں۔ تمہیں اپنے بارے میں کیا بتاؤں......'' بوڑھی ملازمہ نے کچھ اداسی سے کہا تھا۔

باریشہ جیسے ان کی بات نہیں سمجھ سکی تھی۔

''یہ بتاؤ کہ چاند کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہیں وہ......'' حیرت پر قابو پاتے ہوئے اس نے بتایا۔

''اگر میں نے چاند کو کوئی پیغام دینا ہو تو دے دو گی؟''

''جی......دے دوں گی۔ کیا پیغام دینا ہے آپ کو؟''

''نہیں......زبانی کلامی نہیں بتا سکتی......اتنی سکت نہیں ہے مجھ میں......میں خط لکھ دوں گی چاند کو......تم اسے دے دو گی؟''

''جی......دے دوں گی۔ لیکن آپ کون ہیں؟'' باریشہ نے پھر سے پوچھا۔ ملازمہ نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

''تم کب واپس جاؤ گی؟''

''میں مزید تین چار دن یہاں ہی ہوں۔ پھر واپس چلی جاؤں گی۔''

''کیا تم روزانہ اپنے باپ کو دیکھنے آیا کرو گی؟'' ملازمہ نے پوچھا۔

باریشہ کو مزید حیرت ہوئی تھی کہ جس باپ کے بارے میں وہ اپنی زندگی میں اب جان پائی تھی اس کے بارے میں ہسپتال کی ملازمہ کیسے جانتی تھی۔

''جی......!''

''ٹھیک ہے میں اس سے پہلے تمہیں خط دے دوں گی۔ تم چاند تک پہنچا دینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اور اس سے پہلے کہ باریشہ اس سے مزید کوئی سوال پوچھتی، ملازمہ جلدی سے وہاں سے چل دی تھی۔ تذبذب کے سے عالم میں ہی وہ واپس ہوٹل پہنچی۔

''ہو گی چاند نانو کی کوئی جاننے والی...... میں کیوں اتنا سوچ رہی ہوں۔'' اس نے خود سے کہہ کر خود کو تسلی دی۔

وہ چھ دن کراچی میں رہی اور مسلسل چھ دن ہسپتال جاتی رہی۔ اس خاموش مرد کو دیکھنے جس نے اس کی ماں سے بے حد محبت کی تھی۔ اتنی محبت کہ اس کی ماں کی خاطر اپنی اکلوتی بہن کو چھوڑ دیا تھا۔ کیا محبت ایسی ہی ہوتی ہے، محبوب کے علاوہ باقی سب سے بے گانہ کر دیتی ہے۔ زندگی میں ساری فکریں محبوب کے حوالے سے منسوب ہو جاتی ہیں۔ باقی سب پروا بے پروائی تلے دب جاتی ہیں۔

باریشہ میر زاد کو دیکھتی رہتی تھی اور اس سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ وہ اسے بتاتی تھی کہ زندگی کے حادثے نہ ہوئے ہوتے تو اب ان کی زندگی کیسی ہوتی۔ وہ ایک چھوٹے سے گھر میں خوش حال زندگی گزار رہے ہوتے۔ چھٹی والے دن کسی پارک میں جاتے۔ اس کا باپ اس کی ماں کے لیے گنگناتا...... اور اس کی ماں، بچوں سے نظریں بچا کر مسکرایا کرتی۔ زندگی کس قدر حسین ہوتی...... آہ! افسوس...... یہ سب باریشہ کی ذہنی تخلیق تھی۔ حقیقی زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہونے والا تھا۔

باریشہ نے فون کر کے ارشادی بابا کو ساری بات بتا دی تھی۔ جسے سن کر ارشادی بابا نے گہرا سانس بھرا تھا۔

"تمہارے ساتھ اتنا سب کچھ ہو گیا میری جان......اور تم نے مجھے بتایا ہی نہیں......"

"میں شرمندہ تھی ارشادی بابا......"

"واپس آ جاؤ میری جان...... جو محبت کرتے ہیں، وہ شرمندہ نہیں ہونے دیتے۔"

"میں آ جاؤں گی۔ جلد ہی......بس کچھ کام ادھورے ہیں۔ وہ مکمل کرتے ہی میں آ جاؤں گی۔"

"مجھے اور تمہاری چاند نانو کو تمہارا بے صبری سے انتظار ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" باریشہ نے کہا۔

زندگی میں ایک لمبے عرصے کے بعد وہ خوش تھی۔ اس کی ذات پر چھائے نفرتوں، خواہشوں کے بادل چھٹنے لگے تھے اور اندر سے وہ باریشہ نکل کر سامنے آ رہی تھی جو واقعی ہی میں صندل کی بیٹی تھی۔

آج وہ اسلام آباد واپس جا رہی تھی۔ وہ آج آخری بار اپنے باپ کو دیکھنے آئی تھی۔ اس امید پر کہ شاید وہ آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر اپنی بیٹی کو اپنے گلے سے لگا لیں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ باریشہ کو اپنے آنسو خود ہی صاف کرنا پڑے تھے۔

باریشہ نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ تین بج چکے تھے۔ اس کی فلائٹ کا وقت چھ بجے کا تھا۔ اس حساب سے اسے چار بجے تک ایئرپورٹ میں ہونا چاہیے۔ اور ابھی اس کے پاس ایک گھنٹہ مزید تھا کہ وہ اپنے باپ کو دیکھ سکے۔ ضامن نے بھی کہا تھا کہ وہ اسے چار بجے کے قریب ہسپتال سے لینے آ جائے گا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو باریشہ کی سوچوں میں خلل آیا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے لگا تھا کہ شاید نرس ہوگی۔ وہ اسے اب مریض کے پاس سے اٹھ جانے کا کہے گی۔ باریشہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ نرس کی منت کرتے ہوئے چار بجے تک وہاں ہی بیٹھا رہنے کی اجازت لے لے گی۔ لیکن

جب دروازہ کھلا تو اس کے سامنے نرس نہیں تھی بلکہ وہی بوڑھی ملازمہ تھی جس سے وہ تین روز پہلے ہسپتال کی راہ داری میں مل چکی تھی۔

آج اس ملازمہ کے ہاتھ میں ایک خط بھی تھا۔

''یہ لو باریشہ...... یہ تم چاند کو دے دینا۔'' اس نے خط باریشہ کو دیتے ہوئے کہا۔

''ویسے آپ چاہیں تو چاند نانو سے فون پر بھی بات کر سکتی ہیں۔''

''کر تو سکتی ہوں لیکن فون پر بات کرنے کے لیے بہت ہمت چاہیے ہوتی ہے۔ اور میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے۔ اس لیے خط لکھ رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں یہ خط انہیں دے دوں گی۔ لیکن کیا آپ اب بھی مجھے اپنا نام نہیں بتائیں گی؟''

''خط کے اختتام پہ لکھا ہوا ہے۔ تم خط کا وہ حصہ پڑھ سکتی ہو۔'' ملازمہ نے کہا اور پھر لمحہ بھر باریشہ کو دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

ملازمہ کے جانے کے بعد باریشہ نے خط کو کھولا تھا۔ باقی کی عبارت سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے خط کے اختتام پر نظر ڈالی۔ جہاں اس خاتون کا نام لکھا ہوا تھا۔

باریشہ زیرلب وہ نام بڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

''فقط...... ایک نافرمان بیٹی...... روشانے......''

☆......☆......☆

رات گہری ہو کر کچھ مزید سیاہ ہو چکی تھی۔ ایسے جیسے اندھے پن کا شکار ہو گئی ہو۔ خاموشی بھی ایسی پھیلی ہوئی تھی جیسے چرند پرند سب اسلام آباد سے ہجرت کر چکے ہوں۔ سارہ کو ایسی ہی کسی رات کا انتظار تھا۔ اپنے کمرے سے باہر نکل کر اس نے ایک بار تسلی کی تھی کہ سب سو رہے ہیں یا نہیں۔ سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سب اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ کسی کمرے کی

بتی نہیں جل رہی تھی۔ رات میں بس گیٹ کیپر اور کتے جاگتے تھے۔ سارہ کو دونوں کی ہی پروا نہیں تھی۔ گیٹ کیپر اسے جاننے لگے تھے اور اتنے دنوں میں سارہ نے کتوں کو بھی اپنے ساتھ مانوس کر لیا تھا۔

تسلی کر لینے کے بعد سارہ نے اپنے چھوٹے سے کمرے میں جا کر پٹرول سے بھری بوتلوں کو بیڈ کے نیچے سے باہر نکالا۔ جو اس نے کافی دنوں سے چھپا کر رکھی ہوئی تھیں۔ گھر میں بہت سی کاریں تھیں۔ جن کا اکٹھا پٹرول گیلن میں آتا تھا۔ سارہ نے ایک گیلن چوری کر لیا تھا جس کی کسی کو خبر نہیں ہوئی تھی۔ جن گھروں میں حرام کا پیسہ آ رہا ہو، وہاں چیزوں کے ادھر ادھر ہو جانے پر توجہ نہیں دی جاتی۔ سارہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا اور کسی نے تشویش کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ کچرے میں سے خالی بوتلیں نکال کر اس نے ساری بوتلوں کو پٹرول سے بھر لیا تھا۔

کمرے سے باہر نکل کر سارہ نے پٹرول سے بھری چھوٹی بوتلوں کو گھر کے مختلف حصوں میں چھپانا شروع کر دیا تھا۔ کچن کے کیبنوں میں، لاؤنج میں صوفوں کے نیچے، مختلف کمروں میں پردوں کے پیچھے، ٹیبل کے نیچے...... دیواروں کے پیچھے، ستون کی اوٹ میں، سیڑھیوں کے نیچے...... اور ان تمام بوتلوں کے ڈھکن بھی کھول دیے تھے۔ اس نے گھر کے تینوں کچن کی گیس بھی فل آن کر دی تھی۔

باقی پٹرول سے بھری کچھ بوتلیں پکڑ کر وہ گھر کی چھت پر چلی گئی تھی۔ اور اس نے چھت سے دیواروں پر پٹرول گرانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے چھت کا کوئی حصہ نہیں چھوڑا تھا جہاں سے پٹرول نیچے نہ بہایا ہو۔ اس سارے کام سے فارغ ہو جانے کے بعد سارہ نے اپنی چادر کے پلو کی گرہ کھول کر ماچس نکالی تھی۔ اور دیا سلائی کو روشن کیا تھا۔ لمحہ بھر اس نے آگ کی ننھی لو کو دیکھا جو اس سارے گھر کو جلا کر خاکستر کر دینے والی تھی۔ اور پھر پٹرول کو آگ دکھا کر وہ نیچے کی طرف بھاگی تھی۔

دیواروں پر ڈالے گئے پٹرول نے دیکھتے ہی دیکھتے آگ پکڑ لی تھی۔ اور سارا گھر لمحے بھر میں آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ پھر پٹرول کی بوتلیں جو سارہ نے گھر کے مختلف حصوں میں چھپا کر رکھی ہوئی تھیں ان کو بھی آگ نے پکڑنا شروع کر دیا تھا۔ بمشکل دو منٹ لگے تھے اور گھر میں آگ ایسے بھڑک اٹھی

تھی جیسے جہنم کا دروازہ کسی نے اس گھر پر کھول دیا ہو۔ پٹرول اور گیس کے سنگم نے آگ کے شعلوں کو آسمان تک بلند کر دیا تھا۔ پورا گھر جل کر راکھ ہونے کے لیے دس منٹ بھی بہت زیادہ تھے۔ آگ بجھانے والا عملہ تو ابھی اپنے سنٹر سے بھی نہیں نکل سکتا تھا جتنے میں اس گھر کا نام ونشان مٹنے والا تھا۔

''آگ لگ گئی۔ اٹھو...... بھاگو...... گھر میں آگ لگ گئی ہے۔'' سارہ بدحواسی میں ایک ایک کمرے کا دروازہ بجاتے ہوئے سب کو کمروں سے باہر نکلنے کو کہہ رہی تھی۔ خاص طور پر اس نے کومل کے کمرے کا دروازہ شدت سے بجایا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس آگ میں کومل جل کر مر جائے۔



ناول تاش گھر ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 34

آگ کی حدت نے اسلام آباد کے سرد موسم کو گرمی میں تبدیل کر دیا تھا۔ آگ کی لپٹیں اس قدر بلند تھیں کہ رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا اسلام آباد سارا کا سارا روشن ہو گیا تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں سے نکل کر باہر کو بھاگنے لگے تھے۔ ایک نے دوسرے کو جگایا تھا۔ کمروں کے دروازے بجائے جا رہے تھے۔ شور، ہنگامہ، چیخ و پکار، آگ کی حدت......

سارا علاقہ جاگ گیا تھا۔ سب جائے پناہ کی تلاش میں بدحواس گھر کے لان میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کیونکہ گھر کا تو کوئی ایسا حصہ نہیں بچا تھا جو آگ کی لپٹوں سے ڈھکا ہوا نہ ہو۔

رحبانی، کومل، بستامی، ایمن، سانول سمیت سب ملازم اور لڑکیاں لان میں اکٹھی ہو گئی تھیں اور اب سب جلتے ہوئے گھر کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر لگی آگ بتا رہی تھی کہ وہ کچھ بھی سالم نہیں چھوڑے گی۔ یہ بھی واضح تھا کہ ان کی نظریں گھر کی کھڑی عمارت کو آخری بار دیکھ رہی ہیں۔

"یہ...... یہ سب کیسے ہوا؟" کومل ساکت نظروں سے جلتے ہوئے گھر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جیسے پلکیں جھپکنا ہی بھول گئی تھی۔

"فائر بریگیڈ کو فون کرو۔" بستامی چلایا۔

"کر دیا ہے۔ وہ لوگ نکل رہے ہیں۔" گارڈ نے بتایا۔

لیکن سب جانتے تھے کہ فائر بریگیڈ کا عملہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ آگ جس زوروں کی لگی ہوئی تھی

اسے دیکھتے ہوئے قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ تب ہی بجھے گی جب کچھ باقی نہیں بچے گا۔ سب لوگ اب لان سے بھی نکلتے ہوئے گیٹ سے باہر جانے لگے تھے۔ آگ کی شدت کی وجہ سے سب کو گرمی لگنے لگی تھی۔

''یہ...... یہ کیسے ہو گیا۔ میرا گھر جل رہا ہے۔''

کومل شاید حواس سے بے گانہ ہونے لگی تھی۔ وہ جلتے ہوئے گھر کے بے حد قریب کھڑی تھی۔ یا تو اسے گرمی نہیں لگ رہی تھی یا اندر کے دکھ کی اذیت گرمی سے بڑھ کر تھی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ لان میں لگے درختوں نے بھی آگ کو پکڑنا شروع کر دیا تھا۔

''سب جلدی سے یہاں سے دور ہو جاؤ...... بہت دور......'' رحبانی چلایا۔

سب تو پہلے ہی مین گیٹ سے باہر کھڑے تھے۔ اب مزید دور ہونے لگے تھے۔ صرف ایک کومل تھی جو اپنی جگہ پر ساکت کھڑی جلتے ہوئے گھر کو دیکھ رہی تھی۔

''چلو کومل...... باہر چلو...... آگ پھیلتی جا رہی ہے۔''

''یہ...... یہ کیسے ہو گیا بستامی...... میرا گھر کس نے جلا دیا؟'' آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس نے پوچھا۔

''باہر چلو...... سب بعد میں دیکھیں گے۔'' بستامی کومل کو باہر کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

لیکن کومل کا وجود ایسے ساکت تھا جیسے پتھر میں ڈھل گیا ہو۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں جلتے ہوئے گھر کی تصویر جھلک رہی تھی۔ وہ گھر جسے اس نے چاہت سے بنایا تھا اور شوق سے سجایا تھا۔ وہ اب جل رہا تھا۔ اندر کے سارے سامان سمیت...... صوفے، پردے، قالین، ٹیبل، کپڑے، جوتے، جیولری، پینٹنگ، نوادرات...... سب جل رہا تھا۔

''میرا گھر...... جل رہا ہے بستامی...... میرا گھر جل رہا ہے۔'' اور اس سے پہلے کہ بستامی کومل کو کھینچتے ہوئے باہر کی طرف لے کر جاتا، کومل کا وجود بے دم سا ہو کر بستامی کے ہی اوپر آ گرا تھا۔

آگ پر قابو پانے کی کوشش اگلے چار گھنٹے تک جاری رہی تھی۔ چار گھنٹوں کی کوششوں کے بعد آگ بالآخر بجھ گئی تھی۔ اور......اور سارا گھر جل کر خاک ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

پانی سے بھرے ہوئے سفید بادل روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں تیر رہے تھے۔ باریشہ کو یاد آیا جب بہار کی آمد کے بہت بعد حویلیاں میں آک کے درختوں کی ڈوڈیاں پھٹا کرتی تھیں تو سارے میں سفید روئی پھیل جایا کرتی تھی۔ جسے حویلیاں کے لوگ گرم برف باری کہا کرتے تھے۔

اب جہاز میں بیٹھ کر بادلوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے باریشہ کو ایسا ہی احساس ہو رہا تھا جیسے آسمان پر اُگے کسی بہت بڑے آک کے درخت کی ساری ڈوڈیاں پھٹ گئی ہوں اور سفید رُوواں چاروں طرف پھیل گیا ہو۔ یہ منظر بہت دلکش تھا۔ وہ نظریں نہیں ہٹا پا رہی تھی۔ یا شاید یہ اپنے باپ میر زاد سے ملنے کی خوشی تھی کہ اسے بہت بار کے دیکھے ہوئے مناظر بھی پہلے سے زیادہ دل کش دکھنے لگے تھے۔

اس کے موبائل پر میسج ٹیون بجی تو اس کا دھیان کھڑکی سے ہٹا۔ آک کی بڑی بڑی ڈوڈیوں سے نظریں ہٹا کر اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے موبائل نکالا۔ خیام کا میسج تھا۔ باریشہ نے میسج اوپن کیا تو بے اختیار اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ خیام نے اسے فیض احمد فیض کا بہت ہی مشہور شعر لکھ کر بھیجا تھا۔

گلوں میں رنگ بھرے، بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

شعر پڑھتے ہوئے باریشہ کتنی ہی دیر تک مسکراتی رہی۔

وہ شعر میں چھپے خیام کے پیغام کو خوب سمجھ رہی تھی۔ بہت دن ہو گئے تھے دونوں میں کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ خیام نے اس سے ملنے کی آس کو شعر کے روپ میں لکھا تھا۔ باریشہ چند لمحے سوچتی رہی تھی کہ اس شعر کا جواب کیا ہونا چاہیے۔ اس نے شاعری زیادہ نہیں پڑھی ہوئی تھی۔ جتنی پڑھ رکھی تھی یا جس

قدرا سے یاد تھی وہ اسے ہی ذہن میں دہرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس کے ذہن میں حیدر علی کا بہت پہلے کا پڑھا ہوا شعر آیا۔ جو کہ اسے بے حد پسند تھا۔ اسی لیے یاد بھی تھا۔ اس نے وہ شعر موبائل پر لکھا۔

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد
خوش پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے
توجہ نے تیری ہمارے مسیحا
توانا کیے ناتواں کیسے کیسے

یہ اشعار خیام کے پیغام کا جواب بھی تھا اور اس کی مسیحائی کا شکریہ بھی...... اس نے اشعار لکھ کر خیام کو بھیج دیے اور موبائل ہاتھ میں پکڑے وہ پھر سے خیام کے میسج کا انتظار کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ خیام اسے ضرور میسج کرے گا جو کہ یقیناً پھر سے کوئی شعر ہی ہوگا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ چند لمحوں کے بعد خیام کا میسج آ گیا تھا اور باریشہ بے اختیار ہو کر ہنسی تھی۔ اس نے میر تقی میر کا شعر لکھ کر بھیجا تھا۔

توجہ تیری اے حیرت مری آنکھوں پر کیا کم ہے
جو میں ہر اک مژہ دیکھوں کہ یہ تر ہے کہ یہ نم ہے

"کس کے میسج آ رہے ہیں؟" ضامن نے پوچھا۔

خیام کو جواب لکھتے لکھتے باریشہ کے ہاتھ رکے تھے۔ وہ تو جیسے بھولی ہی ہوئی تھی کہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر ہی ضامن بیٹھا ہوا ہے اور اس سے سب چھپانا کس قدر ضروری ہے۔

"نہیں...... کسی کے نہیں۔" اس نے موبائل کو ہینڈ بیگ میں واپس رکھ لیا تھا۔

"تم کافی انجوائے کر رہی تھیں میسج کو میں نے اس لیے پوچھا۔"

"بس جوک تھا۔ اور کچھ نہیں۔" باریشہ نے بات کو ٹالا تھا اور پھر جلدی سے ہیڈ فون نکال کر کانوں کے ساتھ لگا لیا تھا۔

وہ ضامن پر ایسا ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ جیسے وہ گانے سن رہی ہے۔ اس سے وہ ضامن کے مزید سوالوں سے بھی بچ سکتی تھی۔

پتا نہیں ضامن پر کیا ظاہر ہوا تھا اور کیا نہیں...... لیکن اسے اتنا ضرور پتا چل گیا تھا کہ باریشہ اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔

☆......☆......☆

"آگ اس قدر پلاننگ سے لگائی گئی ہے کہ گھر کا کوئی حصہ محفوظ نہیں رہا۔ حتیٰ کہ سرونٹ کوارٹر جو فاصلے پر تھے وہ بھی جل کر راکھ ہو چکے ہیں۔" انسپکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی بالکل۔ لگتا ہے کہ کسی نے کافی دنوں کی منصوبہ بندی کے بعد آگ لگائی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ گھر پوری طرح سے جل کر ختم ہو جائے۔ لیکن ایسا کرے گا کون انسپکٹر؟"

"ظاہر ہے کہ آپ کا کوئی دشمن ہی ایسا کرے گا۔ خیر آپ کو مکمل رپورٹ درج کروانا ہو گی۔ گھر میں کتنے افراد ہیں۔ کتنے نوکر چاکر ہیں۔ نئے، پرانے ملازم۔ بزنس...... یہ سب جان لینے کے بعد ہی ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔

بستامی کا سر گھوما تھا۔ یہ ساری معلومات دینے کا مطلب تھا کہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنا۔ ملازموں اور لڑکیوں کے بیان دینے کے بعد یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ اس گھر میں کیا کیا کام ہوتا ہے۔

"میرے خیال سے ہمیں کسی کے خلاف کوئی رپورٹ نہیں کروانی ہے۔"

"کیوں......؟"

"جو ہونا تھا، ہو گیا ہے۔ ہم مزید مسئلوں میں نہیں پڑنا چاہتے۔"

"جیسے آپ کی مرضی......"

لیکن بستامی مسئلوں میں گھرنے والا تھا۔ اور وہ جانتا ہی کہاں تھا کہ یہ سب کیسے ہو گا؟ اور کون کرے گا؟

اسلام آباد کے ایک پوش ایریا میں ایک بڑے گھر میں آگ لگ چکی تھی۔ یہ خبر چھوٹی نہیں تھی۔ وہاں میڈیا کے بھی کچھ لوگ رپورٹنگ کے لیے آئے تھے۔ جب سارا نے ان صحافیوں کو بند لفافوں میں بستامی کے گھر کی معلومات دی تھیں۔ اس بند لفافے میں بستامی اور کومل کی قبر تھی۔ اس گھر میں کیا ہوتا تھا اس کی ساری تفصیل چھوٹے بڑے ثبوتوں کے ساتھ اس لفافے میں بند تھی۔ جو جب کھلے تھے تو یہ بات چھپی نہیں رہی تھی کہ اس گھر سے لڑکیاں سپلائی کی جاتی ہیں اور یہ ایک جدید کوٹھا نما گھر ہے۔

اس خبر کو چھپانے کے لیے بستامی نے اپنا سارا اثر رسوخ استعمال کر لیا تھا۔ لیکن سب بیکار گیا تھا۔ بستامی کے سارے بینک اکاؤنٹ فریز کر دیے گئے تھے۔ دوسرے شہر کی لڑکیاں جو اس گھر میں رہ رہی تھیں وہ خود ہی کہیں بھاگ گئی تھی۔ پولیس بستامی کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ قیاس تھا کہ اس پر تین چار طرح کے مقدمے چلیں گے۔



حویلیاں پر وہ دن بہت زیادہ دھوپ لے کر وارد ہوا تھا۔ جیسے مدتوں کے اندھیرے کے بعد اب دھرتی والوں کو روشنی کی نوید سنانے آیا ہو۔ ستون کے ساتھ ٹیک لگائے چاند کتنی ہی دیر تک آسمان کو دیکھتی رہی۔ آج اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔

دوائیاں وہ پیشگی پیس کر رکھ چکی تھی۔ پھر آج کا دن اتنا اُجلا اُجلا تھا کہ چاند کا دل کرتا تھا کہ وہ بس آسمان کو دیکھتی جائے۔ نجانے کیوں اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا جا رہا تھا کہ اس کے دل پر لگے سارے داغ بس اب دھلنے والے ہیں۔ اور اس کا دل چاندی کی طرح پھر سے سفید اور چمک دار ہو جائے گا۔

داغوں سے اسے پیلی چتیوں والا سانپ یاد آ گیا۔ وہ اکثر اسے دودھ دینا بھول جایا کرتی تھی۔ سانپ بھی بھلا مانس تھا۔ وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا کرتا تھا۔ رسوئی سے جلدی سے کٹوری میں دودھ بھر کر چاند درگا مورتی والے کمرے میں آئی۔ سانپ بھی چاند کو دیکھ کر درگا مورتی کی ٹانگ سے الگ ہوا

اور کمرے کے وسط میں پڑی کٹوری سے دودھ پینے لگا۔ چاند بہت پیار سے سانپ کو دودھ پیتا ہوا دیکھ رہی تھی جب باہر سے بڑا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ چاند اکثر حویلی کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا کرتی تھی۔

آنا ہی کس نے ہوتا تھا حویلی میں...... دوائی لینے والی عورتوں نے یا پھر ارشادی بابا نے...... اور تھا ہی کون اس حویلی میں آنے والا۔ ایسا کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا کہ بھولا بسرا چور ہی آجائے۔

اپنے پالتو جانور کو اکیلا چھوڑ کر چاند باہر نکلی۔ دالان سے اتر کر صحن میں قدم رکھتے ہی چاند کے قدم اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے۔ اس کی آنکھیں دھوکا کھا رہی تھیں یا واقعی ہی میں اس کے سامنے باریشہ کھڑی تھی۔

"باریشہ...... یہ تم ہی ہو نا......؟" چاند نے آنکھوں کو بھینچتے ہوئے جیسے باریشہ کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی نانو...... یہ میں ہی ہوں۔ آپ کی نافرمان نواسی......" باریشہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ چاند نے آگے بڑھ کر باریشہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"میری بچی...... میری جان...... اب تو چھوڑ کر نہیں جاؤ گی مجھے۔" چاند نے پوچھا۔ باریشہ نے انکار میں سر ہلایا تو چاند نے پھر سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ "میں نے بہت دعائیں کی تھیں تیرے لیے باریشہ...... کہ تم میرے پاس واپس آجاؤ۔ خدا نے اس بار میری دعاؤں کو جلدی سن لیا ہے۔" چاند سب بتاتے ہوئے رونے لگی تھی۔ "میری بچی دوبارہ مجھ سے خفا مت ہونا، جو تم کہو گی میں وہی کروں گی۔"

"اتنا مت روئیں چاند نانو...... کچھ آنسو سنبھال رکھیں۔ کوئی اور بھی ہے میرے ساتھ جسے دیکھ کر آپ کو رونا آجائے گا۔"

"کون......؟" باریشہ سے الگ ہوتے ہوئے چاند نے پوچھا۔

''ارشادی بابا......! اندر آجائیں۔'' باریشہ نے باہر کی طرف پکارتے ہوئے کہا۔

ارشادی بابا دروازہ پار کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے کسی بوڑھی اور ناتواں خاتون کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جسے وہ سہارا دیتے ہوئے اندر لا رہے تھے۔ چاند نے اس بوڑھی کو دیکھا اور چاند کو یاد نہیں آیا تھا کہ وہ اس عورت سے کبھی پہلے مل چکی ہے۔ وہ عورت چاند سے بھی زیادہ عمر رسیدہ معلوم ہوتی تھی۔

''یہ...... یہ کون ہے؟'' چاند اسے پہچان نہیں سکی تھی۔ اسی لیے باریشہ سے اس کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

''تہمینہ پھپھو کی بیٹی...... افشیں......'' باریشہ نے بتایا اور چاند کے چہرے پر حیرت پھیلتی چلی گئی۔ قریب ہوتے ہوئے انہوں نے افشیں کو غور سے دیکھا تھا اور پھر اگلے ہی لمحے افشیں کو زور سے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''افشیں...... میری بچی......''

چاند نے جیسے چیخ ماردی۔ اور پھر اس چیخ کے بعد ایک رونا تھا جو دونوں طرف سے شروع ہوا تھا اور پھر بہت دیر بعد بھی رکنے میں نہیں آیا تھا۔ چاند کے تو نجانے کون سے غبار تھے جو باہر نکل آئے تھے اور افشیں بھی ایسی روئی تھی جیسے مدتوں کا رونا آج ہی رو لینا چاہتی ہو۔

سورج کی روشنی مزید بڑھ گئی تھی۔ چاند کو اب احساس ہوا تھا کہ اس کو آج کا دن اتنا اجلا اجلا کیوں معلوم ہو رہا تھا۔ سارا بھی حویلی آچکی تھی۔ تعبیر کی قید کی مدت پوری ہونے والی تھی اور افشیں...... اس کی آنکھوں نے افشیں کو بھی دیکھ لیا تھا۔

''میں تم سے بہت خوش ہوں باریشہ...... تم نے صندل کی بیٹی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔''

ارشادی بابا نے باریشہ کے قریب ہوتے ہوئے کہا تو باریشہ نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا۔

☆......☆......☆

کومل ہسپتال میں تھی۔ اس کی طبیعت سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ ہوش میں آتی تھی تو دیوانوں کی طرح چلانے لگی تھی۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق اسے بے ہوشی میں ہی رکھا جا رہا تھا۔ زندہ ہوتے ہوئے وہ کافی دنوں سے مردہ بنی ہوئی تھی۔

رحبانی، ایمن، سانول...... اسلام آباد والے پرانے گھر میں شفٹ ہو چکے تھے۔ پرانے گھر پہنچ کر ایک اور بات انہیں معلوم ہوئی تھی کہ افشیں وہاں سے بھاگ چکی تھی۔ جس پر رحبانی سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا کہ کہیں وہ پولیس کے پاس نہ چلی جائے اور وہ سب مزید مسئلوں میں نہ الجھ جائیں۔ سارے گھر والے ان دنوں سخت پریشانی میں مبتلا تھے۔

"آپ دعا کریں اماں جی، ہمارے لیے...... یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔" ایمن نے ایک دن روتے ہوئے سارا سے کہا تھا۔ جو مصلے پر بیٹھی تسبیح کر رہی تھی۔

"آزمائش ہے۔ جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ فکر مت کرو بیٹی۔"

سارا نے دعا دینے کے سے انداز میں کہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کرنے والی سارا ہی ہے۔ انہیں اونچائی سے نیچے گرانے والی۔ اور تباہی کے دہانے تک لانے والی۔

سارا ان دنوں بہت خوش تھی۔ وہ جو چاہ رہی تھی سب ویسا ہی ہو رہا تھا۔ اس نے خوشی خوشی چاند نانو کو فون کیا تھا۔ وہ چاند کو ساری روداد سنانا چاہتی تھی لیکن چاند نے سارا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سارا کو ایک خوشی کی خبر سنا دی تھی۔

"سارا! جلدی گھر آ جاؤ...... تمہاری کزن افشیں آ گئی ہے۔"

یہ خوشی کی خبر ایسی تھی کہ سارا وہاں سے بہانہ بنا کر اسی وقت حویلیاں جانے والی بس میں سوار ہو گئی تھی۔



بہت دیر کی ڈرائیونگ کے بعد ضامن کار کو اب ایک بہت بڑی سی گول بلڈنگ کے پاس لے آیا تھا۔ یہاں پر ناسمجھ میں آنے والا شور باریشہ کے کانوں میں اترا تھا۔ شور شاید بہت دور سے آ رہا تھا اسی لیے غیر واضح تھا۔

''یہ شور کیسا ہے ضامن......؟''

اس نے ضامن سے پوچھا جو کار کو کسی مناسب جگہ پر پارک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہاں بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔ اور ضامن کو شاید کار کے لیے جگہ ملنی مشکل ہو رہی تھی۔

''ابھی پتا چل جائے گا تمہیں۔'' اس نے کہا۔

کار پارک کرنے کے بعد دونوں کار میں سے نکل کر ایک بڑے گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ ضامن نے اپنی پاکٹ سے کوئی کارڈ نکال کر گارڈ کو دکھایا اور گارڈ نے دونوں کو اندر جانے دیا۔ گیٹ سے اندر داخل ہونے پر ایک لمبی راہداری ان کے سامنے تھی۔ تب بھی باریشہ کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں آئی ہے۔

وہ اسٹیڈیم میں تھی وہ یہ بات تو جانتی تھی لیکن آج تو یہاں کوئی میچ بھی نہیں تھا۔ پھر ضامن اسے یہاں کیوں لے آیا تھا؟

''تم مجھے کہاں لے آئے ہو ضامن......؟'' باریشہ نے ضامن سے پوچھا تھا۔

''راہداری میں چلتی جاؤ...... باہر نکلو گی تو دیکھو گی۔'' ضامن نے بتایا پھر بھی نہیں تھا۔

دونوں لمبی راہداری پار کر کے کھلے احاطے میں آئے تھے اور باریشہ لمحے بھر کے لیے دم بخود رہ گئی تھی۔ وہاں اس قدر زیادہ رش تھا کہ باریشہ نے اپنی پوری زندگی میں اتنے لوگوں کو ایک جگہ پر اکٹھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ضامن سے کچھ پوچھنے کے بجائے ہجوم کی نوعیت کو خود سے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے بالکل سامنے ایک بہت بڑا اور روشن اسٹیج تھا۔ جہاں ٹیم میوزک کے انسٹرومنٹ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ

کر رہی تھی۔اور بیک گراؤنڈ میں ستار کی کسی دھن کی آواز گونج رہی تھی۔

''تم نے بتایا تھا کہ تمہیں عابدہ پروین بہت پسند ہے۔''

''ہاں......!''

''تو میں نے تمہارے لیے عابدہ پروین کے کنسرٹ کا ٹکٹ لے لیا ہے۔''

''کیا واقعی...... یہ عابدہ پروین کا کنسرٹ ہے؟'' باریشہ نے بے یقینی سے پوچھا۔

ضامن نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوہ مائی گاڈ...... یہ تو واقعی ہی میں بہت اچھا سرپرائز ہے۔'' باریشہ نے چہک کر کہا اور اسٹیج کی طرف دیکھا۔ جہاں پر ابھی عابدہ پروین نہیں آئی تھی۔ اسٹیج کو ان کی آمد کے لیے ہی تیار کیا جا رہا تھا۔

''ابھی تو ایک سرپرائز اور ہے باریشہ...... جو تمہیں اس سے بھی زیادہ اچھا لگے گا۔'' ضامن نے دل میں سوچا تھا اور اپنے کوٹ کی پاکٹ پر ہاتھ رکھا تھا۔ جہاں ایک چھوٹی سی مخملی ڈبیا کے اندر ڈائمنڈ کی انگوٹھی موجود تھی، جو اس نے کل ہی باریشہ کو پرپوز کرنے کے لیے خریدی تھی۔

اسٹیج پر عابدہ پروین کی آمد کا اعلان ہوا تھا۔ اور مجمع نے اتنی بلند آواز سے ہاہاکاری کی تھی کہ لگتا تھا کہ آج تو زمین پھٹ کر ہی رہے گی۔ عابدہ پروین اسٹیج پر آ کر اپنے مخصوص انداز میں بیٹھ گئی تھیں۔ ہاتھ جوڑ کر انہوں نے سب کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنا پہلا کلام پڑھنے کا آغاز کیا۔ ابھی ساز ہی چھیڑے گئے تھے کہ سارا مجمع سمجھ گیا تھا کہ کون سا کلام پڑھا جائے گا۔ مزید شور ہونے لگا تھا۔

''جب سے تو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔''

''اف...... ضامن...... یہ کلام مجھے بہت پسند ہے۔'' باریشہ نے کہا۔

''آج کی رات تمہیں سب پسند آئے گا باریشہ......'' ضامن نے اس کے کان کے پاس آ کر سرگوشی کی۔

بار یشہ نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ وہ ''دیوانے'' پر جھومنے لگی تھی۔ اسٹیج پر لگی لائٹس بھی سامعین پر ڈسکو ڈانس کر رہی تھیں۔ مجمع تو ایسے تھا جیسے آج ''دیوانہ'' ہو کر رہے گا۔ بار یشہ بھی چند ہی لمحوں میں اپنا آپ بھول گئی تھی۔

ضامن بار یشہ کو دیکھتا جا رہا تھا۔ جسے دیکھتے رہنے سے آج اس کا دل نہیں بھرنے والا تھا۔ بار یشہ جھومتے جھومتے آگے نکل گئی تھی۔ اور اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے ضامن کا دل محبت سے بھرتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے دائیں بائیں نایاب پھول پودے اگتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ اور اسے ایسے لگنے لگا تھا جیسے اس کا وجود کسی نے اگر کے کھیت میں کھڑا کر دیا ہو۔

پہلا کلام ختم ہو جانے کے بعد وہ اس کے پاس آئی تھی۔

''ضامن......! یہاں سب نے لڑکے لڑکیوں نے کلائی پر کسی مخصوص پینٹ کی مہر لگوائی ہوئی ہے۔ لڑکی کہہ رہی تھی کہ ابھی عابدہ پروین جب ''مائی یار دی گھڑولی'' پڑھے گی تو لائٹ بجھا دی جائے گی۔ پھر کلائیوں پر لگی یہ مہر چمکنے لگے گی۔''

''UV پینٹ ہوگا۔ کنسرٹ پر اس طرح ہوتا رہا ہے۔''

''مجھے بھی کلائی پر کچھ بنوانا ہے ضامن......''

''میرے خیال سے وہ مین گیٹ پر ہو رہا ہوگا۔ ہم دوسرے گیٹ سے آئے ہیں۔ چلو میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں۔''

''نہیں......تم یہاں ہی رکو......میں وہاں جا کر خود ہی بنوا لیتی ہوں۔''

''رش بہت ہے۔ تم کھو جاؤ گی۔''

''اتنی بھی بات نہیں۔ تم اس بورڈ کے پاس ہی کھڑے رہنا۔ میں بس جلدی سے آجاؤں گی۔''

بار یشہ کہہ کر وہاں سے چل دی تھی۔ مین گیٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ جب وہ وہاں پہنچی تو مہر لگانے والے اپنا

سامان سمیٹ رہے تھے۔

''مجھے بھی مہر لگوانی ہے۔'' اس نے ایک لڑکی سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ جلدی بتایئے کہ کیا لگوانا ہے۔ تھوڑی دیر میں لائٹس بند ہو جائیں گی۔''

''پھول...... پھول چاہیے مجھے اپنی کلائی پر۔''

''صرف تین طرح کی مہریں ہیں مس...... تتلی، سورج اور ستارہ...... آپ کو ان تینوں میں سے ہی کچھ لگوانا ہو گا۔''

''لیکن مجھے تو اپنی کلائی پر پھول چاہیے تھا۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''کیا میں بنا دوں؟'' ایک دلکش آواز اس کے کانوں میں اتری تھی۔ باریشہ نے پلٹ کر دیکھا تھا اور کھل اٹھی تھی۔

''خیام...... تم یہاں......؟''

''ہاں...... مجھے معلوم تھا کہ ضامن تمہیں لے کر یہاں ہی آنے والا ہے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا اور چپکے سے میں بھی یہاں آ گیا۔''

''ضامن نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو کچھ اور مطلب لے لے گا۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ ابھی اس بات کو چھپانا ہے۔''

''ہاں...... جانتا ہوں۔ لیکن اتنے رش میں وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ آؤ...... تمہاری کلائی پر پھول بنا دوں۔'' خیام نے کہا اور پھر باریشہ کی کلائی کو پکڑ کر UV پینٹ میں انگلی ڈبو کر وہ باریشہ کی کلائی پر پھول بناتے ہوئے باریشہ کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

''پھول پر توجہ دو۔ مجھ پر نہیں......'' وہ شوخی سے بولی۔

''پھول تو میں آنکھیں بند کر کے بھی بنا سکتا ہوں۔ میرے اسٹوڈیو میں ایک پھول چہرہ دیکھ تو

چکی ہو تم......" اس نے کہا۔

باریشہ نظریں چرا گئی۔

عابدہ پروین نے بھی محبت کے راگ چھیڑ دیے تھے۔ جو شاید ان دونوں کے دل کی آواز تھی۔

"اب چلتی ہوں۔ ضامن میرا انتظار کر رہا ہوگا۔" پھول بن گیا تو باریشہ نے جلدی سے اپنی کلائی پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"میں بھی چلتا ہوں پھر...... یہ شور شرابا میری طبیعت کے خلاف ہے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ گھر پر ملاقات ہوگی۔ میں شائستہ آنٹی سے ملاقات کا بہانہ بنا کر آج اسلام آباد میں ہی رکنے والی ہوں۔" اس نے بتایا تو خیام کے چہرے پر مسکراہٹ نمایاں ہوئی تھی۔

خیام کو الوداع کر کے اور کلائی پر بنے پھول کو پھونک مار کر سکھاتے ہوئے وہ ضامن کی طرف جا رہی تھی جب لائٹس بند کر دی گئی تھیں۔ ہجوم نے ایک بار پھر سے شور مچایا تھا۔ ایسا کہ آسمانوں کو چھونے لگا تھا۔

باریشہ نے چاروں طرف دیکھا۔ شور اور اندھیرے میں وہ بھولنے لگی تھی کہ ضامن کہاں کھڑا ہے۔ دوسری طرف عابدہ پروین نے مائی یار دی گھڑولی کے بول بولے تھے اور لڑکے لڑکیاں باؤلے ہو گئے تھے۔ سب نے ہاتھ اوپر کر کے لہرانے شروع کر دیے تھے۔ اندھیرے میں تتلی، سورج اور ستارے والی مہریں چمکنے لگی تھیں۔

باریشہ بہت دیر تک لوگوں کو دائیں بائیں کرتے ہوئے اندھیرے میں ضامن کو تلاش کرتی رہی۔ پھر اس نے ہار مان لی۔ یہ سوچ کر کے وہ واپسی پر کار کے پاس جا کر کھڑی ہو جائے گی۔ ضامن وہاں تو آ ہی جائے گا۔ کیوں نہ ابھی کلام سے لطف لے لیا جائے۔ وہ ممکنہ حد تک اسٹیج کے قریب ہو گئی تھی۔ اور مائی یار دی گھڑولی پر جھومتے ہوئے ہاتھ لہرانے لگی تھی۔

بورڈ کے پاس کھڑا ضامن بے چینی سے باریشہ کا انتظار کر رہا تھا۔ کافی دیر ہو چکی تھی باریشہ واپس

نہیں آئی تھی۔ وہ مین گیٹ تک گیا۔ وہاں مہر لگانے والے جا چکے تھے۔ ضامن پھر سے اپنی جگہ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ موبائل نکال کر اس نے باریشہ کو کال بھی کی تھی لیکن شور میں شاید وہ کال کی آواز سن نہیں سکی اور تب ہی لائٹس بند کر دی گئیں۔ ضامن سمجھ گیا تھا کہ اب باریشہ کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ لیکن اسے تسلی تھی کہ باریشہ کار تک تو خود پہنچ ہی جائے گی۔ اس کے گم ہو جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ بھی چار و ناچار کلام کو انجوائے کرنے لگا اور تتلیوں، سورج اور ستارے کی مہروں والے ہاتھوں کو دیکھنے لگا جو اندھیرے میں جگمگ کر رہے تھے۔ کچھ نے مہر ہاتھ کی پشت پر لگوائی تھی۔ کچھ نے کلائی پر...... کچھ نے بازو پر...... تتلی کا رنگ سرخ تھا، سورج کا پیلا اور ستارے کا سبز...... پورے اسٹیڈیم میں یہ سارے رنگ چھائے ہوئے تھے۔ ضامن کی نظر بہت سے لہراتے ہاتھوں میں سے ایک پر رکی تھی۔ اس کلائی پر پھول بنا ہوا تھا۔ بڑا سا پھول...... سرخ، سبز اور پیلا...... تینوں رنگوں کو ملا کر بنایا گیا پھول......

ضامن نے چاروں طرف دیکھا، لہراتے ہوئے سارے ہاتھوں کو...... وہاں کسی کے ہاتھ میں پھول نہیں بنا ہوا تھا۔ اس کا مطلب کیا تھا؟

مہریں بس تین طرح کی ہی تھیں۔ پھر باریشہ نے اپنی کلائی پر پھول کیسے بنوا لیا تھا۔ وہ بھی اس قدر صفائی سے......؟

کیا یہ اس نے خود سے بنایا تھا۔ یا کسی اور نے......؟

''مائی یار دی گھڑولی بھر دی......''

ضامن کا سر گھومنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

رات تو معمول کی راتوں جیسی ہی تھی۔ اس کی سیاہی بھی روز والی ہی تھی۔ پھر سامنے کی سڑک کیوں دکھائی نہیں دے رہی تھی...... کیوں ضامن کی آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی تھی؟ راستہ کیوں

ہموار ہونے کے باوجود اس کو پیچیدہ نظر آنے لگا تھا۔ اس نے ایک نظر پھر سے باریشہ کو دیکھا جو اپنی کلائی پر بنے بڑے سے پھول کو دیکھتی جا رہی تھی۔

''لگتا ہے کہ تم آج کنسرٹ میں جا کر بہت خوش ہوئی ہو۔''

''بہت زیادہ......اور اس کے لیے تمہارا شکریہ......''

''مینشن ناٹ......کیا تم حویلیاں جانا چاہتی ہو؟ کیا میں تمہیں حویلیاں چھوڑ دوں؟''

''نہیں......مجھے خیام کے گھر جانا ہے۔ شائستہ آنٹی نے ملنے کو کہا تھا۔ پھر وہاں میرا کچھ سامان بھی ہے، اسے بھی لینا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ضامن نے کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔ باقی کے سارے راستے اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ انگوٹھی جو اس کی پاکٹ میں تھی، وہ پاکٹ میں ہی رہی تھی۔ اسے دینے کا وقت نہیں آیا تھا۔ باریشہ نے ضامن کی خاموشی کو نوٹس کیا لیکن اس نے اس بارے میں کوئی سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دوسرے معنوں میں اس نے ضامن کی خاموشی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں خیام کے گھر میں تھے۔

''میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ شائستہ آنٹی سو چکی ہوں گی۔ میں ان سے صبح مل لوں گی۔''

''جیسے تمہاری مرضی......''

باریشہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ضامن خیام کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ اس نے بے حد آہستگی سے دروازہ کھولا۔ خیام بیڈ پر لیٹا سو رہا تھا۔ وہ منہ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ ضامن نے اس کی انگلیوں کو دیکھا۔ ہاتھ دھو لینے کے باوجود ان میں کچھ کچھ پینٹ کے نشان موجود تھے۔ سرخ، سبز اور پیلے پینٹ کے نشان......کیا وہ آج کوئی پینٹنگ کرتا رہا تھا یا یہ والا پینٹ کوئی اور تھا؟

خیام لائٹ بند کیے بنا سونے کا عادی تھا۔ اپنے شک کو یقین دینے کے لیے ضامن نے کمرے کی لائٹ بند کر دی تھی۔ اور تب ہی جیسے ایک دھماکا ہوا تھا۔ وہ دھک سے دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ اس کا شک درست تھا۔

اندھیرے میں خیام کی انگلیوں میں لگا پینٹ جگمگا اٹھا تھا۔ یہ مصوری والا پینٹ نہیں تھا۔ یہ UV پینٹ تھا۔ جس کی ایک بڑی سی مہر باریشہ کی کلائی پر ثبت ہو چکی تھی۔ محبت کی مہر......

تو خیام کانسرٹ میں موجود تھا۔ اسی نے باریشہ کی کلائی پر پھول بنایا تھا۔ اور اسی پھول کو دیکھتے ہوئے باریشہ کی مسکراہٹ تھی کہ رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔

ضامن خیام کے اسٹوڈیو میں گیا تھا اور پہلے سے بھی زیادہ بڑا دھماکا ہوا تھا۔ وہاں پڑا ہر پورٹریٹ باریشہ کا تھا۔ ہنستی ہوئی باریشہ...... مسکراتی ہوئی باریشہ...... اداس بیٹھی باریشہ...... اور محبت جھلکاتی باریشہ......

کب سے چل رہا تھا یہ سب......؟ اسے کیوں نہ خبر ہوئی۔ اور سب سے بڑی بات...... دونوں نے اس سے کیوں چھپایا؟

''اتنا بڑا کھیل کھیلا گیا ہے میرے ساتھ......'' ضامن کو ایسا لگنے لگا تھا جیسے دوست کی دھوکا دہی کے بعد اس کا دل بند ہونے والا ہو۔

☆......☆......☆

بارہ کہو میں دن کو طلوع ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ پہلے تو خیام نے اٹھ کر فریش ہونے میں دیر لگائی۔ پھر جب باریشہ تیار شیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلی تو دن کے دس بج چکے تھے۔ شائستہ انتظار کی اذیت سے دوچار ہو رہی تھیں۔

''ضامن کہاں ہے؟'' شائستہ نے خیام سے پوچھا۔

''وہ صبح میرے اٹھنے سے پہلے ہی جاگنگ کے لیے جا چکا تھا۔''

''لیکن اب تو کافی دن نکل آیا ہے۔ اب تک تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔''

''آپ ناشتا لگوا دیں۔ اسے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی خواہش ہوتی تو اب تک آ چکا ہوتا۔'' خیام نے کہا۔

اسے بھوک لگ رہی تھی۔ خود شائستہ کو بھی...... اس لیے شائستہ نے ٹیبل پر ناشتا لگوا دیا تھا۔ ابھی ان سب نے ناشتا شروع ہی کیا تھا کہ ضامن باہر سے وہاں آیا۔

''آؤ ضامن! ناشتا کرو...... تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔'' شائستہ نے پیار سے کہا۔

نجانے ضامن نے شائستہ کی بات سنی تھی یا نہیں...... وہ بس خیام اور باریشہ کو دیکھتا جا رہا تھا۔ ان دونوں نے بھی ضامن کو دیکھا تھا۔ ضامن کا سارا جسم سرخ ہو رہا تھا۔ جیسے وہ جاگنگ کر کے نہیں بلکہ دس بارہ آدمیوں کے ساتھ کشتی کر کے آ رہا ہو۔ اس کے جسم سے اتنی گرمی اٹھ رہی تھی کہ دور بیٹھے خیام کو اس کے جسم کی حدت محسوس ہوئی تھی۔ ایسے جیسے وہ کسی کو قتل کرنے کا ارادہ باندھ رہا ہو۔ پھر بنا کچھ بولے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''ضامن! ناشتا نہیں کرو گے؟''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' جواباً اس نے سرد مہری سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' شائستہ کو ضامن کی سرد مہری پر تعجب ہوا۔

''زویا آنٹی کی طبیعت کے حوالے سے کچھ پریشان ہے۔''

خیام نے ہمیشہ کی طرح اپنے دوست کی پردہ پوشی کی تھی۔ پھر سب خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔ لیکن خیام اور باریشہ دونوں سے ناشتا کرنا دوبھر ہو چکا تھا۔ دونوں کو کچھ کھٹک ہوئی تھی کہ کوئی بات ہوئی ہے۔

شائستہ جب تک ٹیبل پر بیٹھی رہیں انہیں بھی مجبوری میں وہیں بیٹھے رہنا پڑا۔ جیسے ہی شائستہ وہاں سے اٹھ کر گئیں، خیام نے بھی فوراً ناشتا چھوڑ دیا۔

''میں ضامن کے پاس جا رہا ہوں۔''

''میں بھی آ رہی ہوں۔'' باریشہ بھی خیام کے پیچھے ہوئی۔

خیام نے کمرے کا دروازہ کھولا تو سامنے کا منظر عجیب تھا۔ ضامن بیڈ پر بیگ رکھے اس میں اپنے کپڑے ڈال رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے بہت جلدی میں ہو، یا لاپروائی کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ وہ کپڑے تہ کرنے کے بجائے انہیں بیگ میں پھینک رہا تھا۔

''کہاں کی تیاری ہے؟'' خیام نے پوچھا۔

ضامن نے آواز کی سمت دیکھا۔ خیام کے پیچھے باریشہ بھی آ کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ ایسے آ کھڑے ہوئے تھے جیسے ابھی ابھی اپنی منگنی کروا کر آ رہے ہوں۔ ضامن نے بہت مشکل سے اپنے تاثرات کو نارمل رہنے دیا تھا۔

''گھر جا رہا ہوں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہنے کی کوشش کی تھی۔

''لیکن کیوں......تو تو کہہ رہا تھا کہ تجھے یہاں کافی دن رہنا ہے۔''

''اب دل بھر گیا ہے۔''

''دل کیوں بھر گیا ہے ضامن......ایسا کیا ہوا ہے؟'' باریشہ نے پیار سے پوچھا۔ ''ابھی تو میں بھی چند دن یہاں ہوں۔ تب تک تم بھی یہاں رہ لو۔''

''یہاں رہ کر کیا کروں......؟'' ضامن نے باریشہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری اور خیام کی محبت کی آنکھ مچولی دیکھوں......؟''

ضامن کا زہر خند لہجہ ایک دم سے کمرے کی فضا کو پراگندہ کر گیا تھا۔ خیام اور باریشہ دونوں نے

ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نظریں جھکالی تھیں۔ بنا کسی خطا کے وہ مجرم بن چکے تھے۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا جگری دوست مجھے دھوکا دے گا۔''

''میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا ہے ضامن...... ہم تجھے بتانے والے تھے۔ بس کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔''

''مناسب موقع...... پتا نہیں وہ کیا ہوتا ہے۔''

''ضامن...... میری بات سنو...... یہ میرا مشورہ تھا کہ میں خود تمہیں کسی بہتر دن یہ بات بتاؤں۔ اپنے دوست سے ناراض مت ہو۔ جو قصور ہے وہ میرا ہے۔ تمہارے دوست کے لیے تم سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ میں نے ہی خیام سے کہا تھا کہ وہ اپنی محبت کو اہمیت دے۔''

''اور اس نے تمہاری بات مان لی۔ پہلی بار اس نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے تمہاری بات مان کی۔ کیونکہ اس بار اس کا اپنا فائدہ تھا۔'' ضامن نے طنز کیا۔

''ضامن! کیوں اس قدر بدگمان ہو رہے ہو؟''

''نہیں...... بالکل نہیں...... میں بدگمان نہیں ہو رہا ہوں۔ لیکن پتا نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔ شاید تم دونوں کا مجھ سے چھپانا مجھے برا لگ رہا ہے۔ یا شاید کچھ اور ہے۔ ظاہر ہے باریشہ...... میں اپنی چاہت کے حوالے سے تمہارے ساتھ زبردستی تو نہیں کر سکتا ہوں۔ کوئی بھی نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن شاید میں ہرٹ ہوا ہوں۔ تو مجھے برا لگ رہا ہے، اس لیے میں جا رہا ہوں۔''

''اس طرح ناراض ہو کر تو مت جاؤ۔''

''نہیں، ناراض ہو کر نہیں جا رہا ہوں۔ بس شاید اب میرا ادھر رکنا بے کار ہے۔ اس لیے جا رہا ہوں۔ خیر فکر مت کرو۔ میں جلد ہی خود کو سمجھا لوں گا۔ کوئی اتنی بڑی بات نہیں...... دنیا کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ جب دوست نے دوست کو دھوکا دیا ہو۔''

خیام دکھی ہو چکا تھا۔ ضامن کے لفظ تیر کی طرح اس کے دل میں اترتے جا رہے تھے۔ اس نے ضامن کی ذہنی صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کو چھپانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اس بات کو دھوکے کا نام دیا جائے گا۔ ضامن بات تو کر رہا تھا کہ وہ ناراض نہیں ہے۔ لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کس قدر ناراض ہو چکا ہے۔

''کل چلے جانا...... اگر آج ہی جانا ضروری ہے تو رات میں چلے جانا۔ ہم تینوں آج کہیں گھومنے جائیں گے۔'' باریشہ نے صورتِ حال کو نارمل کرنے کی غرض سے کہا۔

''میں نے کل رات ہی ٹکٹ بک کروالی تھی۔ میری فلائٹ کا وقت ہو چکا ہے۔ اسی لیے ابھی جانا بہتر ہے۔'' وہ اپنا سارا سامان سمیٹ چکا تھا۔ اور اب بیگ کو بند کر رہا تھا۔

''ہم تجھے چھوڑنے جاتے ہیں۔'' ہمت کرتے ہوئے خیام نے آفر دی تھی۔

''مجھے تنہائی چاہیے۔'' ضامن نے گہرا سانس بھرتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔ اسے خیام کا اپنے اور باریشہ کے لیے ''ہم'' کا لفظ بولنا گراں گزرا تھا۔

''پلیز...... کوئی مجھے چھوڑنے گیٹ تک بھی نہ آئے۔ خدا حافظ!'' بیگ پکڑ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

خیام اور باریشہ نے ایک دوسرے کو دیکھ کر نظریں جھکا لیں تھیں۔ دونوں ایسے چپ کھڑے تھے جیسے چوری کرتے پکڑے گئے ہوں۔

☆......☆......☆

1975ء

روشن بیگم کے کوٹھے پر محفل کا عروج چل رہا تھا۔ رقاصہ بہت خوب صورت رقص پیش کر رہی تھی۔ جس پر قدر دان دل کھول کر پیسہ لٹا رہے تھے۔ محفل جوان ہی تھی جب روشن بیگم نے وہاں آ کر ساز

والوں کو ساز بند کر دینے کا اشارہ کیا تھا۔ رقاصہ کا رقص ادھورا رہ گیا تھا۔ اور سب نے حیرت سے روشن بیگم کو دیکھا۔

''معاف کیجیے گا۔ چند نا گزیر وجوہات کی بنا پر آج کی محفل برخاست کرنا پڑ رہی ہے۔'' روشن بیگم نے ہاتھ جوڑتے ہوئے سب قدر دانوں سے التجا آمیز لہجے میں کہا تھا۔ ''پھر کبھی تشریف لائیے گا۔ جی بھر کر خدمت کی جائے گی۔''

''کوئی بات نہیں روشن بیگم...... آپ کے کوٹھے پر پہلی بار معذرت کی گئی ہے۔ تو یقیناً کوئی بڑا عذر ہوگا۔'' ایک قدر دان نے کہا۔ اور پھر اس سمیت باقی سب بھی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلے گئے تھے۔

''شمعیں بجھا دو...... لیکن ابھی ساز مت سمیٹنا...... مجھے آج صرف اپنے لیے محفل سجانی ہے۔ اور رخسانہ! تم...... میرے کمرے میں آؤ۔'' روشن بیگم کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

اپنے پیچھے سب کو تجسس میں چھوڑ کر رخسانہ جلدی سے روشن بیگم کے پیچھے لپکی تھی۔

''سب خیریت تو ہے نا روشن بیگم......؟'' رخسانہ نے پوچھا۔ روشن بیگم نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر وہ خود کو ایسے دیکھنے لگی تھیں جیسے آج خود کو دیکھتے ہوئے دل نہ بھرنے والا ہو۔

''وہ...... وہ ساڑھی یاد ہے تمہیں...... جو اقبال نے ہمارے لیے ہندوستان سے منگوائی تھی۔ زری کی ساڑھی...... بتا رہا تھا کہ اسے اصلی سونے کی تاروں سے بنایا گیا ہے۔''

''جی...... ایسا ہی ہے۔ زری کی ساڑھی سونے کی تاروں سے ہی بنتی ہے روشن بیگم...... اس جیسی قیمتی ساڑھی تو آپ کے پاس اور کوئی نہیں ہے۔''

''اسے نکال کر تو لاؤ ذرا...... اور مجھے پہنا دو۔ اور باہر کسی ملازم سے کہہ دو کہ سارے کمرے میں سرخ پھول نچھاور کر دے۔ اور ایک ٹوکری گیندے کے پھولوں کی الگ سے چاہیے۔ کہنا، ڈھونڈ کر

معیاری پھول لائے۔"

"جی اچھا......" رخسانہ پہلے پیغام دینے باہر گئی اور پھر کسی ٹرنک سے سرخ زری کی ساڑھی نکال لائی تھی۔

"کس قدر دہکتا ہوا سرخ رنگ ہے اس کا...... ایسے جیسے کسی مہ پارہ کا قتل کر کے اس کے خون سے کپڑا رنگ دیا ہو۔" روشن بیگم نے ساڑھی کو دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

رخسانہ ان کی ایسی تلخ بات پر چونکی تھی۔ لیکن پھر خاموشی سے انہیں ساڑھی باندھنے لگی تھی۔

"میرا نولکھا ہار...... اسے بھی لے آؤ...... اور باقی کے سب گہنے بھی میرے سامنے رکھ دو۔"

رخسانہ الماری سے نولکھا ہار نکال لائی تھی۔ اور گہنے والے صندوق کو اس نے روشن بیگم کے آگے کر دیا تھا۔

روشن بیگم چن چن کر اس میں سے قیمتی اور خوب صورت گہنے نکالتی جا رہی تھیں۔

"لگتا ہے کہ آج تو کسی بہت ہی "خاص" نے آنا ہے۔" رخسانہ نے چٹخارہ سا بھرتے ہوئے کہا۔ روشن بیگم نے اسے دیکھا اور پھیکا سا مسکرائیں۔

"ہاں...... خاص تو ہے۔" وزنی کنگن اپنے بازوؤں پر چڑھاتے ہوئے انہوں نے بتایا۔

"کون ہیں...... ہمیں بھی تو پتا چلے۔"

"یہ پازیبیں پہنا دو مجھے......" انہوں نے کہا۔

رخسانہ ان کے قدموں میں بیٹھ کر انہیں وزنی پازیبیں پہنانے لگی۔ روشن بیگم کنگن اور نولکھا ہار پہننے کے بعد اب کمر بند باندھنے لگی تھیں۔

"اب میرا اچھے سے میک اپ کر دو رخسانہ...... پھر ٹیکا جھومر لگا دینا۔ یاد رکھنا...... بہت ہی حسین تیار کرنا ہے مجھے۔ ایسا جیسا پہلے کبھی نہ کیا ہو۔"

"فکر مت کریں بیگم صاحبہ...... ایسا تیار کروں گی جیسے آج آپ کی نتھ اتروائی ہے۔ صاحب اعلیٰ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔" رخسانہ ہنسی تھی۔

"یہ ہی تو میں چاہتی ہوں۔ وہ مجھے دیکھے تو حیران رہ جائے کہ روشن بیگم آج اتنی روشن کیسے لگ رہی ہے۔"

"ویسے ہیں کون وہ......؟"

"مجھے سرخ لپ اسٹک لگانا...... میرے مداح کہتے ہیں کہ میں اس میں بہت حسین لگتی ہوں۔" انہوں نے بہت کے لفظ کو کھینچتے ہوئے ادا کیا تھا۔ جیسے کسی حسرت کو یاد کیا ہو۔

"جی اچھا......" رخسانہ دل و جان سے روشن بیگم کا میک اپ کرنے لگی تھی۔ ملازم لڑکا سارے کمرے میں گلاب کے پھولوں کی پنکھڑیاں نچھاور کر گیا تھا اور بستر لحاف پر عطر بھی...... گیندے کے پھولوں سے بھری ایک ٹوکری وہ سرہانے کے پاس چھوڑ گیا تھا۔

"دیکھیے خود کو...... کتنی پیاری لگ رہی ہیں آج آپ......"

"ہاں...... تم نے بہت اچھا کام کیا ہے میری بچی...... میں ایسا ہی چاہتی تھی کہ دیکھنے والا دنگ رہ جائے۔" روشن بیگم نے رخسانہ کے ہاتھ چومتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا صاحب اعلیٰ کے لیے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کروں؟"

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں...... اسے بس مجھ سے کام ہے۔ کھانے پینے سے مطلب نہیں۔"

"کہیں کشمیر سے کمال صاحب کے والد محترم تو نہیں آ رہے؟"

"آؤ...... اب مل کر کچھ مزید شمعیں روشن کرتے ہیں۔ یہ برقی قمقمے بجھا دو۔ مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

رخسانہ نے برقی قمقمے بجھا دیے تھے۔ اور دراز سے ڈھیر ساری موم بتیاں نکال لی تھیں۔ دونوں انہیں روشن کرتے ہوئے کمرے میں جا بجا رکھنے لگی تھیں۔

یہ کام کر لینے کے بعد روشن بیگم عطر چھڑک کے پلنگ پر جا لیٹیں۔ وہ کچھ کچھ مسکرا رہی تھیں۔ اور رخسانہ کو کچھ کچھ بے چینی ہونے لگی تھی۔

روشن بیگم کی مسکراہٹ آج اتنی پھیکی کیوں تھی؟

''اب میرے پاؤں پر سرخ مہندی لگا دو رخسانہ...... یہ آخری کام ہے۔''

''جی اچھا......'' رخسانہ روشن بیگم کے پاؤں پر سرخ مہندی لگانے لگی تھی۔ ''ویسے ایک بات ہے۔ میں تو بے چین ہو گئی ہوں کہ اس قدر اہتمام کس کے نصیب کا ہے۔ آپ نے اتنا اہتمام آج تک کسی کے لیے کیا تو نہیں......''

''کیسے کرتی رخسانہ...... وہ آج پہلی بار جو آ رہا ہے۔'' روشن بیگم نے گہرا سانس بھرا۔ ''جبکہ میں تو کب سے اسے پکار رہی ہوں۔ اس نے میری پکار پر آج لبیک کہا ہے۔''

روشن بیگم کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ رخسانہ کام کرتے رک سی گئی تھی۔

''میں بارہ سال کی تھی جب میری ماں نے مجھے ایک پچاس سال کے آدمی کے کمرے میں دھکا دے کر دروازہ باہر سے بند کر لیا تھا۔ تاکہ میں بھاگ نہ جاؤں...... وہ دروازہ بند نہ بھی کرتی تو میں بھاگ نہیں سکتی تھی کیونکہ اس آدمی کی گرفت میری طاقت سے کہیں زیادہ تھی۔ اندر بند کمرے میں اذیت سے دوچار ہوتے ہوئے میں نے اسے پہلی بار پکارا تھا۔ اور تب سے اب تک نجانے کتنی بار پکار چکی ہوں۔''

''کس کو روشن بیگم......'' رخسانہ کھڑی ہوئی تھی۔

''آزادی، رہائی، سکون...... ویسے لوگ اسے نجانے کیوں موت کا فرشتہ کہتے ہیں۔'' روشن بیگم نے کہا تھا اور مہندی والا کٹورا رخسانہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔ وہ روشن بیگم کی طرف لپکی تھی۔

''روشن بیگم...... یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ......''

''شش...... روتے نہیں میری بچی...... یہ مقسوم ہے۔ مقسوم کو بدلہ نہیں جا سکتا۔ یہ ہو کر رہتا ہے۔ اس سے بچنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔''

"کیا کیا ہے آپ نے اپنے ساتھ روشن بیگم......؟ بتائیں مجھے۔" رخسانہ سسکیاں بھرنے لگی تھی۔

"وہ ہیرا جو مجھے میری نتھ اترائی پر ملا تھا، میں نے اسے پیس کر پھانک لیا ہے۔"

"لیکن کیوں روشن بیگم؟"

"کیونکہ ایک روشن عورت کی موت بھی روشنی جیسی ہونی چاہیے۔ میرا جسم میرا ساتھ چھوڑتا جا رہا ہے۔ موت کا وقت قریب ہے اور مجھے یہ گوارا نہیں کہ میں کسی کی محتاج ہو جاؤں۔ اپنی ماں کی محتاجی کے بعد میں کسی کی محتاجی نہیں چاہتی۔ اس لیے آج میں نے موت کے فرشتے کو زبردستی بلا لیا ہے۔"

"یہ آپ نے کیا کیا روشن بیگم......" رخسانہ روتی جا رہی تھی۔

"کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر جاؤ...... اور سازندوں سے کہو کہ ساز چھیڑ دیں۔ سکل بن پھول رہی سرسوں...... اور جب تک سورج طلوع نہ ہو جائے ساز بجاتے رہیں۔ جاؤ میری بچی......" روشن بیگم نے کہا اور رخسانہ کو خود سے الگ کیا۔

رخسانہ روتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔

چند لمحوں کے بعد سازندوں نے باہر سکل بن پھول رہی سرسوں کا ساز چھیڑ دیا تھا۔ اندر روشن کمرے میں روشن بیگم نے گیندے کے پھولوں سے بھری ٹوکری کو اپنے سینے پر رکھا تھا۔ اپنے خواجہ (خدا) کو چڑھاوا پیش کرنے کے لیے......

"میرے پاس ان پھولوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے میرے خواجہ (خدا)...... میرے اعمال میں گناہوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جسے میں تیری نذر میں پیش کر سکوں۔ میں اتنی مضبوط نہیں تھی کہ تیری دنیا کی گندگی سے خود کو بچا سکتی۔ میرے چڑھاوے کو قبول کرنا میرے خواجہ...... میرے چڑھاوے کو قبول کرنا۔" کہتے ہوئے روشن بیگم نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی آنکھیں صبح کی سفیدی نہیں دیکھ سکیں گی۔



روشن بیگم فوت ہو چکی تھیں۔ اس خبر نے ان کے مداحوں کو بے حد افسردہ کر دیا تھا۔ حویلی میں بھی ان کی موت کی خبر پہنچی تھی اور سب لمحے بھر کے لیے دکھی ہو گئے تھے۔ روشن بیگم اس قدر زندہ دل اور روشن تھیں کہ ان کی موت پر ان کے دشمنوں کو بھی دکھ ہوا تھا۔

لیکن حویلی سے کوئی ان کے جنازے پر نہیں گیا تھا۔ صرف بستامی اور کومل ہی ان کے جنازے میں شریک ہوئے تھے۔ ایمن اور رحبانی اسلام آباد سے آ گئے تھے۔ جس قدر روشن انداز میں وہ فوت ہوئی تھیں اسے دیکھ کر ان کی موت کا غم اپنے آپ ہی کم ہونے لگا تھا۔

موت کے تیسرے دن روشن بیگم کا سارا اثاثہ ان کی وصیت کے مطابق کومل اور ایمن میں تقسیم کر دیا گیا تھا جو کہ بہت زیادہ تھا۔ روشن بیگم کے پاس بہت سے تو سونے کے زیورات تھے۔ اور دو ایک جگہ پر انہوں نے زمین وغیرہ بھی خریدی ہوئی تھی۔ جس کی ان کی زندگی میں تو کسی کو خبر نہیں تھی لیکن موت کے بعد وصیت میں یہ سب سنتے ہوئے سب کو حیرت ہو رہی تھی۔

ماں کی موت کے دکھ سے نکلنے کے بعد کومل نے پہلا کام تو یہ کیا تھا کہ ایمن کے ساتھ مل کر اسلام آباد کے ایک پورش ایریا میں بہت بڑا پلاٹ لیا تھا اور پھر اس پر تعمیراتی کام بھی شروع کروا دیا تھا۔ روشن بیگم کی چھوڑی ہوئی دولت، افشیں کے مرحوم شوہر کی جائیدادیں اور دائیں بائیں کے غیر قانونی کاموں سے کومل کے پاس اتنی دولت اکٹھی ہو چکی تھی کہ وہ اسلام آباد میں اپنے خوابوں کا محل بنوا سکتی۔

ایک طرف گھر بننا شروع ہو چکا تھا اور دوسری طرف کومل نے دل و جان سے اس گھر کے لیے خریداری کرنا شروع کر دی تھی۔ قالین، پردے، برتن، نوادرات...... نجانے کس کس طرز کا سامان وہ اکٹھا کر رہی تھی۔ بازاروں میں سارا سارا دن خریداری کرتی رہتی تھی۔ ملازموں سے ان کے علاقے کی خاص خاص چیزوں کا اس نے الگ سے کہا ہوا تھا۔ وہ بہت چاہت سے اپنا خواب پورا کر رہی تھی۔

کومل نہیں جانتی تھی کہ جس گھر کو وہ اس قدر چاہت سے بنوا رہی ہے۔ یہ ہی گھر ایک دن اس کی

آنکھوں کے سامنے جل کر راکھ میں تبدیل ہو جائے گا۔ اسے مستقبل کا کچھ علم ہوتا تو شاید وہ اپنی سی کچھ حکمت عملی کرتی...... اتنی مکاری اور سنگ دلی کا مظاہرہ نہ کرتی...... ایک اچھی خاصی رقم اب اس کے ہاتھ میں تھی۔ گھر بھی بن رہا تھا۔ پھر بھی اس کا لالچ تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔

روشانے کو اس نے اپنے ہاتھوں میں لیا ہوا تھا۔ ایک خوب صورت لڑکے کی تصویر اس نے روشانے کو دکھائی تھی جسے دیکھنے کے بعد روشانے کے دل کی بے قراری تھمنے میں نہ آتی تھی۔

''تمہاری ماں اور چاند تمہیں یہاں کے ہی کسی پینڈو اور جاہل کے ساتھ بیاہ دیں گی۔ انہیں مجھ سے لاکھ اختلاف سہی، لیکن وہ تمہارا تو بہتر سوچ سکتی ہیں۔ کیا برائی ہے اس رشتے میں...... لڑکا اس قدر ہینڈسم ہے۔ کراچی کے رئیس لوگ ہیں۔ اتنا شاندار گھر بار ہے۔ لان ہے، سوئمنگ پول ہے۔ اب میں تو ایک دو بار بات کر چکی ہوں اور بے عزتی بھی کروا چکی ہوں۔ اب تمہیں ہی یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لینا ہو گا۔ ہمت کر کے اپنی منوا سکتی ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ یہاں حویلیاں کے ہی کسی جاہل سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ......''

کومل نے روشانے کو بھڑکایا تھا اور وہ بھڑک گئی تھی۔ دندناتی ہوئی وہ اپنی ماں کے کمرے میں گئی تھی۔

''کیا آپ نے ان دنوں میں میرے لیے کوئی رشتہ تلاش کیا ہے؟'' روشانے نے تہمینہ سے پوچھا تھا۔

''ہاں...... کرماتی کو کہا ہوا ہے میں نے کہ تمہارے لیے کوئی اچھا سا رشتہ دکھائے......''

''کرماتی کو...... جس کے ٹوٹے پھوٹے رشتے سارے حویلیاں میں مشہور ہیں۔''

''تو اور کس سے کہوں......؟ میں خود تو باہر جا کر لڑکے دیکھنے سے رہی۔ کیا چاہتی ہو کہ گھر گھر جا کر دستک دوں اور پوچھوں کہ لڑکے کا رشتہ ہے؟''

''مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کومل آنٹی کے لائے رشتے کو دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔'' روشانے

نے زچ ہو کر کہا۔

تہمینہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ کومل نے اس کی بیٹی کو بہت خوب صورتی سے اپنے ہاتھوں پر ڈال لیا تھا۔ اور یہ کم بخت روشانے...... ماں سے زیادہ کسی اور کو اپنا خیر خواہ سمجھنے لگی تھی۔

"کومل کے جاننے والے اس قابل ہیں کہ انہیں گھر بلایا جائے۔ ان کے ہاتھ بیٹی کا رشتہ دیا جائے۔"

"وہ خاندانی لوگوں کا رشتہ ہی لائی ہیں۔ ایسے ویسے لوگ نہیں ہیں وہ...... اور اگر جاننے والے ہیں بھی تو کیا برائی ہے۔ امیر لوگوں میں ویسے بھی ان دنوں مجرے دیکھنے کا رواج چل نکلا ہے۔ وہ اسے آرٹ اور فن کہتے ہیں۔ منہ مانگی قیمت دے کر اپنے گھر کی شادیوں میں بلاتے ہیں۔"

"منہ پر ہی آرٹ اور فن کہتے ہوں گے۔ پیٹھ پیچھے جو جو کہتے ہیں وہ میں تو منہ سے نکالنے سے رہی۔"

"کومل آنٹی مجھے سب بتا چکی ہیں۔ ان میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ لڑکے کی تصویر بھی دکھا دی ہے انہوں نے مجھے۔"

روشانے نے ماں سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔ اور باقی کی باتیں تو ایک طرف لیکن روشانے کی آخری بات پر تہمینہ نے اسے تاڑ لیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ دیکھ لیتے ہیں وہ رشتہ...... لیکن اگر کوئی ایک بھی بات پسند نہ آئی تو انکار کر دیں گے۔"

"دیکھ لینے کے بعد بے شک کر دیجیے گا۔"

تہمینہ جانتی تھیں کہ اب روشانے سے بحث بے کار ہے۔ زہرہ، شکیلہ اور چاند سے مشورہ کر کے لڑکے والوں کو گھر پر بلا لیا گیا تھا۔

کومل نے وہی کھیل کھیلا تھا جو تعبیر کی باری کھیلا جا چکا تھا۔ نقلی لڑکے اور اس کے گھر والوں کا اتنا اعلیٰ انتظام کیا گیا تھا کہ کسی کو چاہ کر بھی کوئی خرابی نظر نہیں آئی تھی۔ لڑکا خوب صورت تھا، جوان تھا اور گھر بار بہت شان دار تھا۔ بستامی تہمینہ کو کراچی لے جا کر لڑکے کا کاروبار بھی دکھا آیا تھا۔ بے چاری تہمینہ کہاں جانتی تھیں کہ وہ ایک بار پھر سے بے وقوف بننے جا رہی ہیں۔

''لڑکے والے رسم کا کہہ رہے ہیں۔'' کومل نے بڑے کمرے میں پہنچ کر اعلان کرنے کے سے انداز میں کہا تھا۔اس اعلان میں تفاخر ہی تفاخر تھا۔کمرے میں چاند بھی موجود تھی۔اور کومل کی آواز سے ظاہر تھا کہ اس نے یہ چاند کو سنانے کے لیے کہا ہے۔ورنہ وہ یہ بات تہمینہ سے کمرے میں جا کر بھی کہہ سکتی تھی۔لیکن اس کے بڑک مارنے میں فتح کا عنصر غالب تھا کہ دیکھو میں جو چاہتی ہوں کر کے رہتی ہوں۔ اور تمہاری یہاں سننے والا کوئی نہیں ہے۔

''بستامی سے کہو کہ رسم سے پہلے لاہور سے میری بیٹی افشیں کو بلا دے۔'' تہمینہ پھپھو نے کہا۔

''اس کی بہن کی رسم ہونے والی ہے۔اس کا بھی یہاں پر موجود ہونا ضروری ہے۔'' تہمینہ نے کہا تو کومل لمحے بھر کو پریشان ہوگئی تھی۔

افشیں تو اسلام آباد والے گھر میں قید تھی اور اسے یہاں لانے کا مطلب تھا کہ سارے منصوبے کو بے نقاب کر دینا۔

''میں نے بات کی ہے افشیں سے...... اس نے کہا ہے کہ وہ نہیں آسکتی ہے۔'' بستامی نے بتایا۔

''ایسے کیسے نہیں آسکتی ہے۔جب سے شادی ہوئی ہے، وہ آئی ہی نہیں...... اب بلایا ہے تو بھی نہیں آسکتی ہے۔کیسا شوہر ہے اس کا جو اسے ماں کے گھر جانے ہی نہیں دے رہا۔لاؤ میری بات کرواؤ اس سے......''

''ٹھیک ہے، رات میں کروادوں گا۔''

لیکن وہ رات نہیں آئی تھی جب تہمینہ کی بات افشیں سے ہوسکتی۔بستامی اور کومل دونوں مل کر کوئی نہ کوئی بہانہ بنادیا کرتے تھے۔تہمینہ کو غصہ تو بہت آرہا تھا لیکن وہ اب روشانے کی وجہ سے خاموش تھیں۔اگر کومل یا بستامی سے بات بگڑتی تو اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے جاسکتا تھا۔اور روشانے ماں سے بدظن ہوسکتی تھی۔

''رسم تو کریں...... آجائے گی افشیں بھی......''

روشانے نے چڑچڑے پن سے کہا تھا۔اسے ماں کی افشیں کی ضد کرنا برا لگ رہا تھا۔وہ تو کسی

قیمت پر نہیں چاہتی تھی کہ لڑکے والوں کی کسی بات کو رد کیا جائے۔ مبادا کہیں لڑکے والے ناراض ہو کر رشتہ ختم کر دیں۔ تہمینہ کو مجبوری میں رسم کی رضامندی دینا پڑی۔

جمعے والے دن روشانے کی منگنی کی رسم ہو گئی تھی۔ اور اسی دن شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی تھی۔ ایک مہینہ بعد شادی کی تاریخ رکھی گئی تھی۔ روشانے خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ وہ رخصت ہو کر کراچی جانے والی تھی۔ یہ بات اس کے لیے دوسرے سیارے پر جانے کے مترادف تھی۔

''رسم پر افشیں نہیں آئی تو کوئی بات نہیں...... لیکن شادی افشیں کے بنا نہیں ہو گی۔ یاد رکھنا بستامی...... جب تک افشیں نہ آئی، روشانے رخصت نہیں ہو گی۔ میں نے افشیں کی شادی کی ہے، اسے بیچا نہیں ہے کہ اسے بھول جاؤں۔''

''آجائے گی شادی پر...... شوہر کے ساتھ چترال گھومنے نکلی ہوئی ہے۔ آجائے گی۔ شادی کی تیاریاں تو کریں۔''

تہمینہ چپ چاپ شادی کی تیاری کرنے لگی تھیں۔ روشانے، کرن، اور زارا تینوں بہت خوش تھیں۔ باقی سب بے دلی سے تیاری کر رہے تھے۔

چاند کا تو کسی کام میں اب دل ہی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ کسی بت کی طرح ہر جگہ موجود تو نظر آتی تھی لیکن کچھ بولنے، کہنے سننے سے لاچار دکھائی دیتی تھی۔

''افشیں کب آ رہی ہے؟'' شادی سے ایک ہفتہ پہلے تہمینہ نے پھر سے پوچھا۔

''وہ ابھی چترال سے نہیں آئی ہے۔''

''تم نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کی بہن کی شادی ہے۔''

''جی...... بتا دیا تھا۔''

''پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی بہن کی شادی پر نہ آئے۔ اور اپنی ماں سے ملنے کو بے قرار نہ ہو۔ ایسا کیا ہو گیا کہ لاپتا ہی ہو گئی۔ پہلے تو پھر فون پر بات ہو جایا کرتی تھی۔ اب تو مہینوں ہوئے وہ اڑن

چھوہی ہوگئی ہے۔ لاؤ میری بات کرواؤ۔“

”بتایا تو ہے کہ وہ چترال میں ہے۔“

”گھر والوں سے کرواؤ بات میری...... میں پوچھوں کہ کیسی ہے میری بیٹی؟“

”ان کے گھر کا نمبر تبدیل ہوا ہے، چند دنوں میں نیا مل جائے گا۔“ بستامی نے بتایا۔

تہمینہ کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ چاند کے کمرے میں گئی۔ چاند کو ساری بات بتائی تھی۔

”میرا دل کہتا ہے کہ ضرور کچھ ایسا ہے جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے۔ چلو چاند...... لاہور کے لیے چلتے ہیں، مجھے جلد از جلد اپنی بیٹی سے ملنا ہے۔“

”ہم اکیلے کیسے لاہور جا سکتے ہیں پھپھو...... آپ کو معلوم ہے کہ لاہور میں افشیں کا گھر کہاں ہے؟“ چاند نے پوچھا۔

”نکاح نامے کی ایک کاپی میرے پاس ہے۔ وہاں اس کے شوہر کے گھر کا ایڈریس لکھا ہوا ہے۔ ہم تلاش کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے، پھر آج ہی چلتے ہیں۔“ چاند نے رضامندی دے دی تھی۔ دونوں لاہور کے لیے تیار ہونے لگی تھیں۔

کمرے میں کومل اور بستامی کو چکر آنے لگے تھے۔ تہمینہ پھپھو کے ارادے بتا رہے تھے کہ وہ آج افشیں سے مل کر ہی دم لیں گی۔ اور اگر انہیں لاہور والے گھر سے ساری بات معلوم ہوگئی تو روشانے کی قیمت جو ملنے والی تھی وہ پھر کبھی ہاتھ نہیں آنی تھی۔ بلکہ نا صرف روشانے، زارا اور کرن کا بھی وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

”رک جائیں...... کہیں مت جائیں۔“ تہمینہ اور چاند لاہور جانے کے لیے بڑے دروازے سے باہر نکل رہی تھیں جب کومل اور بستامی دونوں نے اپنے کمرے سے نکل کر کہا۔

تہمینہ نے رک کر دونوں کو دیکھا۔

”جہاں آپ جا رہی ہیں وہاں آپ کو افشیں نہیں ملے گی۔ میں تب سے جھوٹ بول رہا ہوں کہ

افشیں اپنے شوہر کے ساتھ چترال میں ہے۔ وہ چترال نہیں گئی۔''

''تو سچ کیا ہے؟ کہاں ہے افشیں...... کہاں ہے میری بیٹی؟''

''سچ سننے کی آپ میں طاقت نہیں ہے۔''

''نہیں...... بولو کیا بات ہے۔ ایسا کیا ہے کہ میں سن نہیں سکتی۔''

''افشیں نے اپنے شوہر کو زہر دے دیا ہے۔ اور خود کسی لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم بستامی......؟''

''یہ ہی حقیقت ہے۔''

''میری بیٹی ایسا نہیں کر سکتی۔''

''اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ اسی لیے میں آپ کو کچھ بتا نہیں رہا تھا۔ افشیں نے تو بہت پہلے ہی ایسا کر لیا تھا۔ میں آپ سے جھوٹ بولتا رہا کہ افشیں اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہے۔ نہیں یقین تو پیپرز دیکھ لیں۔ اس کے شوہر کے بچے میرے پاس آتے رہے ہیں جائیداد کے لیے...... لیکن افشیں نے شوہر کو زہر دینے سے پہلے سب کچھ اپنے نام لکھوا لیا تھا۔ اور پھر آشنا کے ساتھ مل کر ساری جائیداد بیچ دی تھی۔ اس کے شوہر کے بچوں نے افشیں پر مقدمہ بھی کیا تھا۔ میں اس مقدمے کی فائل آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ میرے کمرے میں پڑی ہوئی ہے۔'' بستامی نے ساری کہانی سنائی تھی اور تہمینہ کو ایک چکر سا آیا تھا۔

چاند نے بروقت تہمینہ کو سہارا دیا تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 35

رات وقت سے کچھ پہلے ہی چلی آئی تھی۔ اندھیرا تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ چاند چودھویں کا تھا اور اس کی روشنی جیسے تہمینہ پھپھو کی آنکھوں میں بھر دی گئی تھی۔ تخت پر لیٹی تہمینہ پھپھو کو آج رات نیند نہیں آ رہی تھی۔ کسی نے جیسے ان کے وجود پر گرم ریت انڈیل دی تھی۔ اب جلن تھی کہ ان کے پورے جسم پہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

''افشیں نے اپنے شوہر کو زہر دے دیا ہے۔ اور خود کسی اور لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔'' بستامی کے الفاظ ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔ تہمینہ اور چاند نے مقدمے کی فائل دیکھ لی تھی۔ افشیں کے مرحوم شوہر کی ساری جائیداد افشیں کے نام پر ہی تھی جو اس کے مرنے سے دو دن قبل ہی منتقل ہوئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ افشیں نے اس سے چالاکی سے دستخط کروائے تھے اور پھر شوہر کو زہر دے دیا تھا۔

تہمینہ پھپھو تصور ہی تصور میں افشیں کو یہ سب کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ گلاس میں شوہر کے لیے زہر گھولتے اور آشنا کے ساتھ مل کر بھاگنے کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے۔ اس تصور سے ان کے دل میں ہزاروں کانٹے چبھنے لگے تھے۔

''تو تو بہت معصوم تھی افشیں...... تیری عادل سے محبت بھی معصوم تھی جس کے پورا نہ ہونے کا مجھے افسوس رہے گا۔ لیکن تو اتنی بدچلن کیسے ہوگئی کہ اپنے شوہر کو زہر دے دیا اور آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔

کیا کمی رہ گئی تھی میری تربیت میں۔ کیوں میری کوکھ کو اجاڑ دیا تو نے افشین ...... کیا کہیں گے اب لوگ کہ افشین بدچلن ہے۔ اور میں ایک بدچلن کی ماں ہوں۔"

تہمینہ پھپھو جس قدر سوچتی جا رہی تھیں اس قدر ہی ان کی طبیعت بگڑنے لگی تھی۔ شوہر کے مر جانے کے بعد انہوں نے ساری زندگی سفید پوشی میں گزار دی تھی۔ کبھی کسی ضرورت کے لیے اپنے بھائی دین کو یا چاند کو بھی نہیں کہا تھا۔ پھر اس کی بیٹی افشین میں اس قدر لالچ کیسے بھر گئی کہ شوہر کے معصوم بچوں کی ساری جائیداد ہڑپ لی۔

اس رات کا چاند بہت دیر کے بعد مدھم ہوا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے چاند کچھ سرخ سا ہو گیا تھا۔ جیسے چپکے سے کسی نے چاند پر کسم کا رنگ ٹپکا دیا ہو۔ سب اس خوف ناک رنگ سے غافل اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔

حاجی بوا بدحواسی کے عالم میں چاند کے کمرے میں پہنچی تھیں۔

"چاند...... چاند...... جلدی اٹھو......!" انہوں نے چاند کو بری طرح سے ہلایا تھا۔ چاند ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

"کیا ہوا ہے حاجی بوا......؟"

"جلدی چلو نیچے...... تہمینہ کو نجانے کیا ہو گیا ہے۔"

چاند حاجی بوا سے بھی زیادہ بدحواسی کے عالم میں تہمینہ پھپھو کے کمرے میں پہنچی تھی۔ تخت پر پڑا تہمینہ پھپھو کا سارا وجود تھرتھرا رہا تھا۔ جیسے شدید سردی سے کانپ رہا ہو۔ منہ سختی سے بند تھا اور آنکھیں الٹی ہوئی پڑی تھیں۔

زہرہ اور شکیلہ پھپھو روتی جا رہی تھیں۔

"تہمینہ پھپھو...... تہمینہ پھپھو...... ہوش کریں پھپھو......"

چاند نے تہمینہ پھپھو کو ہلایا۔ ایسے وقت میں وہ جو کر سکتی تھی اس نے کیا۔ تہمینہ پھپھو کو پانی پلانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے ہاتھ پاؤں سہلائے تھے۔

''روشانے اب تمہارے پاس میری امانت ہے چاند......!'' تہمینہ پھپھو نے بمشکل کہا تھا اور چاند کو اس سے بھی زیادہ مشکل سے ان کی بات سمجھ میں آئی تھی۔ ''روشانے کا خیال رکھنا۔''

تہمینہ پھپھو نے کہا اور پھر بری طرح سے تھرتھراتا ان کا وجود پرسکون ہو گیا۔ چہرہ ڈھیلا پڑ گیا تھا اور آنکھیں خود بخود ہی بند ہو گئی تھیں۔

''اناللہ وانا الیہ راجعون۔'' چاند نے کہا تھا اور پھر تہمینہ پھپھو کے وجود پر گر کر زار زار رونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

دین حویلی پر سیاہ دھبے بڑھتے جا رہے تھے۔ پہلا دھبہ دین بابا کی موت پر پڑا تھا۔ پھر صندل، تعبیر، سارہ اور اب تہمینہ پھپھو...... چاند کو کسی پل چین نہ آتا تھا۔ وہ کمرے میں بند ہو کر روتی رہتی تھی۔ وہ ان دنوں اس قدر حساس ہو رہی تھی کہ ننھی باریشہ کے رونے پر خود بھی رونے لگ جایا کرتی تھی۔ حاجی بوا اسے سمجھایا کرتی تھیں لیکن سمجھ جانا مشکل کام تھا۔ اس کے باپ کی ایک نشانی چلی گئی تھی۔ چاند کو لگا کہ وہ رفتہ رفتہ ساری نشانیاں کھو دے گی اور سارے نشان کھو دینے کے بعد دنیا میں ایسے تنہا ہو جائے گی جیسے ریگستان میں کوئی راستہ بھول جاتا ہے اور پھر واپس گھر پہنچنے کے لیے اسے کوئی سنگ میل نہیں ملتا۔ گرم ریگستان میں اس کھو چکے انسان کی موت یقینی ہوتی ہے۔

چند دنوں کے سوگ کے بعد لڑکے والوں کا پھر سے شادی کا پیغام آ گیا تھا۔ وہ شادی کی نئی تاریخ چاہتے تھے اور جلد سے جلد چاہتے تھے۔ روشانے کی بدزبانی کے آگے زہرہ اور شکیلہ پھپھو کا تو کچھ بولنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے دونوں نے یہ ذمہ داری چاند کے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ چاند کو بھی یہ ذمہ داری قبول کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن پھر یہ سوچتے ہوئے کہ یہ ہمت کسی کو تو کرنا ہو گی، چاند نے

روشانے سے بات کی تھی۔

''میرے خیال سے تم اب اس رشتے سے پیچھے ہٹ جاؤ روشانے......'' چاند نے کس قدر پیار سے روشانے سے کہا۔

''کیوں......؟'' اس نے ڈائجسٹ سے نظریں ہٹا کر چاند کو دیکھا۔

''بستامی اور کومل کے لائے رشتوں میں نجانے کیسی منحوسیت ہے کہ کوئی بھی لڑکی خوش نہیں رہ سکی ہے۔ افشیں نجانے کہاں ہے۔ تعبیر مر چکی ہے۔ سارہ رشتے کے بعد ہی اغوا کی جا چکی ہے۔''

''سارہ کے اغوا کا کومل آنٹی کے لائے رشتے سے کیا تعلق؟''

''میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتی لیکن مجھے شک ہے کہ سارہ کا اغوا اسی رشتے کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''تو آپ کہنا چاہتی ہیں کہ سارہ کو بستامی بابا نے اغوا کروایا ہے۔'' اس نے تنک کر پوچھا۔

''نہیں...... لیکن شاید...... وہ لڑکے والے...... جو سارہ کو پسند کر چکے تھے۔ ہمارے انکار پر بھڑک چکے ہوں اور انہوں نے......''

''آپ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہیں چاند امی......!'' روشانے نے ڈائجسٹ ایک طرف پٹخا۔ ''بستامی بابا اور کومل آنٹی سے نفرت نے آپ کو بوکھلا دیا ہے۔ ان پر الزام لگاتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ باقی مجھے کسی سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ کس کے ساتھ کیا کیا ہوا ہے۔ تعبیر کیوں مر گئی، سارہ کہاں گئی یا افشیں کے ساتھ کیا ہوا۔''

''افشیں تمہاری بہن ہے۔ اس کے لیے تو تمہیں فکر مند ہونا چاہیے۔''

''بستامی بابا نے بتا تو دیا ہے جو اس نے کیا ہے۔ یہاں بھی عادل نامی لڑکے کو اس نے اپنے پیچھے لگایا ہوا تھا پھر خود دولت دیکھ کر اس بوڑھے سے شادی کر لی اور عادل کو خودکشی کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہاں لاہور میں بھی اس نے کسی کے ساتھ چکر چلا لیا ہوگا۔ افشیں کردار کی ہلکی تھی، سب جانتے

ہیں۔ فائل دیکھ تو لی ہے آپ نے بھی...... جو حرکتیں افشیں نے کی ہیں اس کے بعد تو اسے بہن کہنا ہی بے کار ہے۔ باقی آپ کو ضرورت سے زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ رشتہ میری ماں طے کر کے گئی تھی، اس نے اپنی تسلی کر لی تھی۔ اب میں نہیں چاہتی کہ کوئی دوسرا میری ماں بننے کی کوشش کرے۔"

روشانے نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔

چاند مزید کیا کہتی۔ الفاظ اس کے منہ میں ہی کہیں دب کر رہ گئے تھے۔

چند دنوں کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا تھا۔ چاند نے روشانے کے کمرے میں گرم دودھ بھجوایا تھا۔ روشانے اپنے کام میں مصروف دودھ پینا بھول گئی تھی۔ کوئی بلی کمرے میں گئی تھی اور اس نے دودھ کا گلاس گرا کر خود دودھ پی لیا۔ یہ بات یہاں تک تو نارمل تھی۔ لیکن اگلے دن صبح کے وقت وہ بلی مردہ پائی گئی تھی جس پر روشانے کے منفی ذہن نے نجانے کون کون سی باتیں گھڑ لی تھیں۔

"آپ نے دودھ میں ایسا کیا ملایا تھا کہ پینے کے بعد بلی مر گئی؟"

"میں کیا ملاؤں گی؟" چاند نے حیرت سے روشانے کو دیکھا۔

"وہی...... جو آپ نے بستامی بابا کے حقے میں ملایا تھا۔" وہ زہر خند سے لہجے میں بولی۔

"تم کیا کہہ رہی ہو روشانے...... میں تمہارے ساتھ ایسا کیوں کروں گی۔"

"کیونکہ میں نے آپ کی بات جو نہیں مانی ہے اور آپ کو اس بات کا دکھ ہو رہا ہے کہ اس حویلی میں کوئی آپ کے مخالف بھی جا سکتا ہے۔"

"کیا اول فول بکتی جا رہی ہو روشانے......"

شکیلہ پھپھو نے روشانے کو ڈانٹا۔ لیکن روشانے کو تو پتا نہیں کس بات کا غصہ تھا کہ وہ آپے سے باہر ہی ہوتی جا رہی تھی۔

"میں اول فول نہیں بک رہی ہوں۔ اصل میں یہ عورت پاگل ہو چکی ہے۔ اس نے مجھے زہر

دینے کی کوشش کی ہے۔"

"بکواس بند کرو اپنی...... ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"ایسا ہی ہے۔ چاند سے اپنی شکست تسلیم نہیں ہو پا رہی ہے۔"

"تم نے ساری زندگی چاند کو چاندامی کہا ہے روشانے......" زہرہ پھپھو نے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔

"نہیں ہے یہ چاندامی...... دیکھا جائے تو ہماری کزن ہے۔ عمر میں بڑی ہے تو ہم اسے عزت دے دیتے ہیں۔ لیکن یہ تو سر چڑھنے لگی ہے۔ چاندامی کے لقب کو اس عورت نے کچھ زیادہ ہی سنجیدگی سے لے لیا ہے۔ یہ تو خود کو ہماری ماں ہی سمجھنے لگی ہے۔"

"تمیز سے بات کرو روشانے......!" حاجی بوا نے غصے سے کہا تھا۔ "مجھے یہ گوارا نہیں کہ کوئی چاند سے اس طرح سے بات کرے۔"

"اور آپ چاند کے ساتھ مل کر جو مرضی خرد برد کریں۔"

"کیسی خرد برد......؟"

"صندل کو گھر سے بھگانے میں آپ نے ہی مدد کی تھی۔ آپ نے ہی کہا تھا کہ بستامی کو کچھ پتا نہ چلے۔ ورنہ اگر تب بستامی بابا کو بتا دیا جاتا تو صندل کو حویلیاں سے باہر نہ جانے دیا جاتا۔ حویلی کی اس قدر بدنامی نہ ہوتی کہ یہاں کوئی اچھا رشتہ آنا ہی مشکل ہو جاتا۔"

"تمہیں کومل کے لائے رشتے کو قبول کرنا ہے تو شوق سے کرو۔ لیکن چاند سے دوبارہ بدتمیزی سے بات مت کرنا۔"

"اب آپ سکھائیں گی ہمیں تمیز...... مت بھولیں کہ آپ اس گھر کی ملازمہ ہیں۔"

"مجھے یاد ہے کہ میں اس گھر کی کیا ہوں۔ تم بھول رہی ہو شاید کہ تمہاری اس گھر میں کیا حیثیت

ہے۔ چاند کے ٹکڑوں پر پلتی رہی ہو۔ اور آج چاند کو ہی باتیں سنا رہی ہو۔"

"چپ ہو جائیں حاجی بوا...... مت کریں یہ سب باتیں۔" چاند نے حاجی بوا کو خاموش کروانا چاہا۔

"نہیں...... بولنے دو مجھے چاند...... جب لوگ احسان فراموش ہو جائیں تو انہیں اپنے احسان یاد دلانا پڑتے ہیں۔ اور تم سنو روشانے...... تم نے یا تمہاری ماں نے کبھی اس گھر میں ایک روپیہ نہیں دیا ہے۔ یہ چاند تھی جس کی وجہ سے تم مالکن کی طرح جیتی رہی ہو۔" حاجی بوا نے روشانے کو شرمندہ کرنا چاہا تھا۔ وہ شاید لمحے بھر کے لیے شرمندہ ہوئی بھی تھی لیکن پھر اگلے ہی پل اس نے جیسے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا کہنا ہے۔

"چاند کو اپنے کھلائے پر اتنا ہی غرور ہونے لگا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ آج سے میں چاند کی ذمہ داری نہیں......" روشانے نے کہا اور پھر بستامی کے کمرے کی طرف منہ کر کے بستامی کو پکارا تھا۔

"بستامی بابا...... بستامی بابا......!"

"کیا بات ہے؟" کومل اور بستامی کمرے سے باہر نکلے۔ وہ جیسے دروازے کے پاس کھڑے باہر نکلنے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔

"بستامی بابا...... میری ماں مر چکی ہے۔ باپ پہلے ہی مر گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ میری ذمہ داری لے لیں۔"

"ٹھیک ہے، جیسے تم کہو روشانے......" بستامی کے بجائے کومل نے کہا تھا۔ "لیکن تمہیں ایک پیپر پر لکھ کر دینا ہوگا کہ تم ہمیں اپنا گارجین بنا رہی ہو۔"

"میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔"

"ایک اور پیپر بھی ہوگا۔ جس پر تم نے لکھنا ہے کہ چاند تمہاری زندگی میں مداخلت نہیں کر سکتی ہے۔" کومل نے نفرت سے چاند کو دیکھتے ہوئے روشانے سے پوچھا۔ روشانے نے بھی نفرت سے چاند کو دیکھا۔

''جی......میں اس پیپر پر بھی سائن کردوں گی۔'' روشانے نے رضامندی دے دی تھی۔

''گڈ گرل......!'' کومل طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے بولی۔اس کی مسکراہٹ چاند کو گھائل کرنے لگی تھی۔چاند نے ان بچیوں کو اپنی سگی اولاد سمجھ کر پالا تھا۔لیکن نجانے کہاں کوتاہی رہ گئی تھی کہ اس کی پرورش کو مجبوری اور اس کی محبت کو غرض سمجھ لیا گیا تھا۔

حویلی میں روشانے کی شادی کی تیاری ہونے لگی تھی۔اس بار یہ تیاری کومل کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

درخت دیو کا روپ دھارے اس کے راستے میں حائل تھے۔ان کی شاخیں تعبیر کو لمبے اور نوکیلے ہاتھوں کی طرح دکھتی تھیں جو اسے دبوچ لینے کے لیے بڑھ رہے تھے۔اسے جھرجھری آرہی تھی۔اور شاید نیند بھی......اس کے باوجود وہ بھاگتی جارہی تھی۔ایک بار پھر سے......اور اس بار وہ حویلیاں پہنچ کر ہی دم لینے والی تھی۔

دو ماہ حاجرہ کے ایک دور کے رشتے دار کے گھر میں رہنے کے بعد وہ آج کشمیر سے نکل آئی تھی۔کشمیر جسے جنت نظیر کہا جاتا ہے اس کے لیے کسی دوزخ سے کم ثابت نہیں ہوا تھا۔حاجرہ کا بیٹا اسے پہاڑی علاقوں کے اختتام تک چھوڑ گیا تھا۔

''آگے کا سفر تمہیں پیدل ہی طے کرنا ہوگا۔بس میں یا ٹیکسی میں بیٹھنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔یہاں سے ایبٹ آباد اور ایبٹ آباد سے حویلیاں زیادہ دور نہیں ہے۔تم تھک تو جاؤ گی لیکن اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔آگے چیک پوسٹ پر پولیس کھڑی ہے۔جہاں کمال کے باپ کے ملازم بھی پہرا دے رہے ہیں۔وہ مجھے پہچان لیں گے ورنہ میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ دیتا۔''

''نہیں......میں پیدل چلی جاؤں گی۔''

''اس راستے سے چلی جاؤ۔درختوں کے پیچھے چھپ کر یہ راستہ عبور کرنا۔کوئی تمہیں دیکھنے نہ

پائے۔اور چہرے سے نقاب ہر گز نہ اتارنا۔“

”نہیں اتاروں گی۔“

”جاؤ......اللہ تمہاری حفاظت کرے۔“ حاجرہ کے بیٹے نے الوداعی جملہ کہا اور تعبیر اس راستے پر چل پڑی تھی۔جس پر اس نے اسے جانے کو کہا تھا۔

ایک رات مسلسل چلنے کے بعد تعبیر سارے بڑے بڑے پہاڑوں کو اپنے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ آگے چھوٹے پہاڑ تھے۔انہیں چاندامی پہاڑوں کے بچے کہا کرتی تھی۔انہی پہاڑوں میں کہیں حویلیاں بھی چھپا بیٹھا تھا، جہاں آج اسے ہر صورت پہنچنا تھا۔نجانے اسے مزید کتنا چلنا تھا۔کتنا بھاگنا تھا۔کہیں حویلیاں پہنچنے تک موت نہ آجائے۔نہیں......خدا اتنا بے رحم نہیں ہو سکتا۔اسے اپنی ماں سے ملنا تھا اور اپنی بہن سے بھی......

دریائے دوڑ کا گدلا پانی پینے کے بعد تعبیر نے پھر سے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

روشانے نے جب سے کومل اور بستامی کو اپنی ذمہ داری دے دی تھی تب سے باقی سب اس سے پیچھے ہو گئے تھے۔چاند، زہرہ اور شکیلہ پھپھو اور حاجی بوا......وہ سب روشانے کی خوشی میں شریک تو تھے لیکن کسی مہمان کی طرح......شادی کے حوالے سے سارا انتظام کومل نے کیا تھا اور اس طرح سے کیا تھا کہ روشانے کو کوئی اعتراض نہیں رہ گیا تھا۔سب بہت شاندار تھا۔کومل نے روشانے کی خواہش پر اس کی مہندی کی رسم کا اہتمام بھی کیا تھا۔کومل کے لیے یہ سب کروانا ضروری تھا۔ابھی دو پیادے اور تھے جن پہ مزید کھیلا جا سکتا تھا۔کرن اور زارا......کومل روشانے کے ساتھ اتنی سگی بنتے ہوئے اصل میں کرن اور زارا کو اپنے دام میں لے رہی تھی۔وقت آنے پر وہ ان سے بھی اپنی ہر بات ایسے ہی منوا سکتی تھی جیسی روشانے سے منوا چکی تھی۔

''کومل...... بات سنو ذرا کمرے میں آ کر......''

بستامی صحن میں آیا تھا۔ کومل ڈھولک پر تالیاں بجا رہی تھی۔ اس کا ابھی وہاں سے اٹھ کر جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ گانے بجانے میں اس کا دل کہیں زیادہ لگتا تھا۔ وہ بستامی کو بعد میں آنے کا کہنے والی تھی جب اس نے بستامی کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ فوراً سے اٹھ کر بستامی کے ساتھ کمرے میں آئی تھی۔

''ایک بری خبر ہے۔'' بستامی بری طرح سے گھبرایا ہوا تھا۔ ''تعبیر نے کمال کو قتل کر دیا ہے۔''

''کیا...... قتل......؟'' کومل کی آنکھیں پھیلی تھیں۔

''ہاں...... یہ دو ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ مجھے اب معلوم ہو رہا ہے۔ سلمان خبر لایا ہے۔''

''تعبیر اب کہاں ہے؟''

''وہ پکڑی نہیں گئی۔ قتل کر کے بھاگ گئی ہے۔ کمال کا باپ پہلے تو پولیس کے رحم و کرم پر رہا، پھر خود چھان بین کرنے پر وہ روشن بیگم تک پہنچا۔ لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ روشن بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لیے اسے ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا، ورنہ نجانے وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتا۔''

''پھر...... اب کیا کرنا ہے؟ اگر تعبیر پکڑی نہیں گئی تو پھر وہ آج نہیں تو کل یہاں پہنچ جائے گی اور ہمارے پول کھول دے گی۔ چاند، زہرہ اور شکیلہ پھپھو تو ہمیں جان سے مار دیں گی۔''

''وہی سوچ کر تو میں پریشان ہو رہا ہوں۔ تعبیر کا کیا بھروسا...... وہ آج رات بھی پہنچ سکتی ہے۔ روشانے کی شادی رک جائے گی۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا بستامی...... بڑی مشکل سے تو اچھا سودا طے ہوا ہے۔ ہمیں کچھ کرنا ہو گا۔''

کومل سوچ میں پڑ گئی اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ پھر جیسے اس کے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

''میں تو کہتی ہوں کہ ہم حویلی چھوڑ دیتے ہیں۔ اسلام آباد والے گھر میں چلے جاتے ہیں۔ اس حویلی میں رہ بھی کیا گیا ہے۔ باغ اور حویلی کا حصہ بعد میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ چاند تمہاری ماں کا سارا زیور پہلے ہی مجھے دے چکی ہے۔''

کومل کی بات پر بستامی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ چند لمحے سوچ بچار کرنے کے بعد اسے لگا کہ کومل ٹھیک کہہ رہی ہے۔

''تم یہاں سے جانے کی تیاری کرو۔ کل روشانے کی رخصتی ہو جانے کے بعد ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ تمہارا اس حویلی میں اگر کوئی ضروری سامان ہے تو اسے لے لو، میں بھی پیکنگ کر لیتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میرے خیال سے یہ ہی ٹھیک ہے۔ حویلی کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔''

بستامی نے رضامندی دے دی تھی اور کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ کومل ڈریسنگ کے پاس گئی۔ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات نارمل کیے۔ بالوں کو سیٹ کیا۔ خود پر تیز پرفیوم کا اسپرے کیا اور باہر جا کر ڈھولک پر گانا گاتے ہوئے تالیاں مارنے لگی تھی، جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ چاند نے کومل کو دیکھا تھا اور وہ سمجھنے سے قاصر رہی تھی کہ کومل کیا چھپا رہی ہے۔

مہندی کا فنکشن ختم ہو جانے کے بعد کومل کرن اور زارا کو چھت پر لے گئی۔

''جی...... کیا بات ہے کومل آنٹی...... کیا ضروری بات کرنی ہے آپ کو؟'' زارا نے پوچھا۔

''ہم حویلی چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ میں اور بستامی...... ہم شاید کل ہی یہ حویلی چھوڑ دیں۔ بس تم دونوں کو یہ ہی بتانا تھا۔'' کومل نے کہا۔

یہ بات سنتے ہوئے کرن اور زارا کے چہروں پر بیک وقت پریشانی اور اداسی جھلکی تھی۔ ایک کومل ہی تو اس حویلی میں تازہ ہوا کا جھونکا تھی اور اب وہ بھی حویلی کو چھوڑ کر جانے کی بات کر رہی تھی۔

''ایسا کیوں کومل آنٹی......؟'' کرن تو جیسے یہ خبر سنتے ہی رو دینے کو تھی۔

''اس حویلی میں اب ہمارا کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ مشترکہ کاروبار ختم ہو چکا ہے۔ چاند ہم سے نفرت کرنے لگی ہے۔ اس نے ایک بار بستامی کو زہر دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ پھر سے ایسا کر سکتی ہے۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں...... روشانے بھی جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ ہو سکتا ہے کہ چاند نے واقعی دودھ میں زہر ڈال کر اسے جان سے مارنے کی کوشش کی ہو۔ کیونکہ چاند بوڑھی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا ذہنی توازن کھوتی جا رہی ہے۔ اس لیے ہمارا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' کومل نے کہا۔

کرن اور زارا دونوں کچھ نہیں بول سکیں۔ وہ بے حد اداس ہو گئی تھیں۔ کومل نے اپنی انگلی سے دو انگوٹھیاں اتار کر کرن اور زارا کو دیں۔

''یہ رکھ لو...... میری نشانی سمجھ کر...... شاید دوبارہ ملاقات نہ ہو سکے۔'' کومل بہت عمدگی سے لوہے کو گرم کر رہی تھی۔

''آپ کے بنا تو ہم بہت اداس ہو جائیں گے۔ کوئی حل ہے کہ آپ نہ جائیں۔'' کرن تو بس رونے ہی والی تھی۔

''بستامی کی زندگی کے لیے مجھے تو یہاں سے جانا ہی ہوگا۔ ہاں...... ایک حل ہے تو سہی...... لیکن شاید تمہیں پسند نہ آئے۔''

''کیا ہے، ہمیں بتائیں تو سہی......'' زارا نے پوچھا۔

''اگر تم دونوں بھی ہمارے ساتھ چلو تو......'' کومل نے آفر کر دی۔

کرن اور زارا دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''اب یہاں رہ ہی کون گیا ہے۔ صندل، تعبیر اور تہمینہ پھپھو مر چکی ہیں۔ افشیں اور سارہ اپنے عاشقوں کے ساتھ بھاگ چکی ہیں۔ کل روشانے بھی رخصت ہو جائے گی۔ پھر تمہیں یہاں رہ کر کیا کرنا ہے۔ ایک ماں کی وجہ سے اپنی زندگی خراب مت کرو۔''

''تو ہم کیا کریں؟''

''کل جب ہم حویلی کو چھوڑیں تو تم دونوں بھی ہمارے ساتھ نکل چلو...... ہم باغ کے راستے سے باہر نکلیں گے۔ کسی کو کان و کان خبر نہیں ہو گی۔ یہاں سے ہم اسلام آباد والے گھر میں جائیں گے جس کا کسی کو علم نہیں ہے۔ پھر جلدی ہی میں تمہاری شادی کسی اچھی جگہ پر کروا دوں گی۔'' کومل نے آنے والے وقت کی جھوٹی کہانی سنائی تھی جسے سن کر کرن اور زارا دونوں ہی مرعوب ہو گئیں۔

''تمہاری مائیں تمہارے لیے کیسے رشتے تلاش کریں گی وہ تم بہت اچھے سے جانتی ہو۔ وہ کرماتی بوا سے کہہ کر بے جوڑ رشتے تلاش کر کے تمہیں بیاہنے کی کریں گی۔ میری مانو تو لمحے بھر کے لیے دل سخت کر لو۔ ہمارے ساتھ اسلام آباد چلو...... شادی کے بعد حویلی واپس آ کر ماں سے معافی مانگ لینا۔ کوئی برائی نہیں ہے اس میں......'' کومل نے کہا تھا۔

کرن اور زارا کے لیے یہ بات نئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ وہ کیا کہیں۔ کومل کی بات ماننے میں کوئی برائی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن یہ فیصلہ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ ایک حقیقت دونوں دل ہی دل میں تسلیم کر چکی تھیں کہ اگر وہ کومل کے ساتھ جاتی ہیں تو وہ روشانے کی طرح ان کی شادی بھی اچھی جگہ پر کر سکتی تھی۔ اور اگر وہ دونوں حویلی میں رہتی ہیں تو قیاس کیا جا سکتا تھا کہ ان کی مائیں ان کے لیے کیسے بے ڈھنگے گھر تلاش کریں گی۔

''تمہارے پاس سوچنے کے لیے ساری رات ہے۔ اچھی طرح سے سوچ لو۔ اور چاہو تو روشانے سے بھی مشورہ کر لو۔ پھر مجھے صبح سوچ کر بتا دینا۔ ہم کل روشانے کی رخصتی کی بھاگ دوڑ میں یہاں سے نکل جائیں گے۔'' کومل کہہ کر سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی تھی۔ کرن اور زارا ایک دوسرے کو ایسے دیکھنے لگیں جیسے سوچ رہی ہوں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔

☆......☆......☆

دن کی شروعات گہما گہمی سے ہوئی تھی۔ روشانے کی رخصتی کا دن تھا۔ اور جھوٹی بارات کی پچی تیاری کی جارہی تھی۔ بستامی اور کومل سب انتظام بہت اچھے سے دیکھ رہے تھے۔ یا ظاہر تو ایسا ہی کر رہے تھے۔ باقی سب کا کردار دور کے مہمانوں جیسا تھا۔ روشانے نے چاند سمیت کسی کو بھی منہ لگانا پسند نہیں کیا تھا۔ کومل کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہوئے اس نے اپنا آپ کومل کے سپرد کیا ہوا تھا۔ خود کو دلہن کے روپ میں دیکھتے ہوئے اس کی خوشی کم ہونے میں نہ آرہی تھی۔ اتنے خوب صورت دولہا کے ساتھ کراچی جانے کے خیال سے اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ دل و جان سے کومل کی احسان مند تھی کہ اس نے اس کے لیے پارلر والی لڑکی کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ وہ حویلی کی پہلی لڑکی تھی جو بیوٹیشن سے تیار ہوئی تھی۔

زہرہ اور شکیلہ پھپھو روشانے کی خوشی میں خوش ہونے کی اداکاری کر رہی تھیں اور چاند باریشہ کو گود میں اٹھائے سب سے نظریں چھپائے رو رہی تھی۔ ایسے موقع پر اسے نجانے کون کون یاد آ رہا تھا۔ دین بابا، صندل، سارہ، تعبیر، افشیں اور تہمینہ پھپھو...... پتا ہی تو نہ چلا اور سب اس حویلی سے رخصت ہو گئیں۔ اب ایک اور لڑکی رخصت ہونے جارہی تھی۔

”دعا کرتی ہوں کہ تمہارے ساتھ کچھ برا نہ ہو روشانے...... تم جو خواب لے کر کراچی جارہی ہو، وہ پورے ہوں۔“ چاند نے آنسو صاف کرتے ہوئے روشانے کو دیکھتے ہوئے دعا کی تھی۔

لڑکے والے وقت کے پابند تھے۔ وہ پورے وقت پر آ گئے تھے۔ نکاح ہو گیا تھا اور پھر چھوہارے بھی تقسیم کر دیے گئے تھے۔ بستامی کی ہدایات پر ملازم کھانے پینے کا انتظام دیکھنے لگے تھے۔ جب کرن اور زارا چھوٹی گٹھڑیوں میں اپنا سامان باندھ کر کومل کے کمرے میں پہنچی تھیں۔

”ہم آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہیں کومل آنٹی......“ کرن نے کہا۔ کومل کے چہرے پر زہر خندی مسکراہٹ جھلکی۔ ہمیشہ کی طرح اس کے سارے تیر نشانے پر لگے تھے۔

”ہم نے روشانے سے بات کی تھی۔ اس نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ اس منحوس حویلی سے چلے

جانا ہی بہتر ہے۔ اس لیے ہم نے آپ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"جیتی رہو میری بچیو...... بہت اچھا فیصلہ کیا ہے تم دونوں نے۔" کومل نے کرن اور زارا کو خود سے لگالیا۔ یہ انداز ایسا ہی تھا جیسے بکرے کو ذبح کرنے سے پہلے پیار کیا جاتا ہے۔ جیسے چڑیا کے پر کاٹنے سے پہلے اسے پیار سے مٹھی میں بھینچا جاتا ہے۔ کومل کی گرفت سانپ کے بلوں کی طرح کی تھی۔ جو آہستہ آہستہ کرن اور زارا کا دم گھوٹنے والی تھی۔ لیکن آنکھوں پر پڑی پٹی کے باعث دونوں کو یہ بل مور پنکھ لگ رہے تھے۔

سورج نصف النہار سے آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سائے اتنے چھوٹے ہوئے جا رہے تھے کہ وجود میں ہی سمٹنے لگے تھے۔ ان چاروں کے سائے بھی ان کے قدموں سے ملے حویلیاں سے دور جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ بستامی، کومل، کرن اور زارا...... چاروں باغ کے راستے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ رہے تھے۔ پردہ پوش ہوئے چاروں اپنے روپوش ہونے کی کسی کو بھی خبر نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس لیے چوروں کی طرح باغ کے راستے سے جا رہے تھے۔

حویلی کے اندر روشانے کو رخصت کرنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ یہ ایسی گہما گہمی تھی کہ باغ کے راستے حویلی کو چھوڑ کر جاتے ان چاروں کی غیر موجودگی کا کسی کو علم نہ ہو سکا تھا۔

زہرہ اور شکیلہ پھپھو نے روشانے کا لباس پکڑے ہوئے اسے دولہے کی کار میں بٹھایا تھا۔ اور کار روانہ ہو گئی تھی۔ ملازم حویلی کے اندر واپس چلے گئے تھے۔ بس زہرہ، شکیلہ، حاجی بوا اور چاند روشانے کی سجی ہوئی کار کو نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ نجانے کیوں چاروں کے دل بند ہوتے جا رہے تھے۔ کیوں ایسا لگنے لگا تھا کہ اب ان کی نظریں روشانے کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گی۔

مخالف سمت سے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی تھی جب چاروں نے ہی اس کی طرف دیکھا تھا۔ بھاگتے ہوئے قدم جو دھول مٹی سے اٹی سڑک پر ایسے پڑ رہے تھے جیسے بھاگنے والے کا دم نکلنے والا

ہو۔ وہ کوئی لڑکی تھی شاید...... جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لباس بے ترتیب تھا۔ اور حالت ایسی تھی جیسے جھاڑیوں پر گھسٹتی ہوئی آ رہی ہو۔ ایک پاؤں میں جوتی تھی اور ایک پاؤں بنا جوتی کے تھا۔ لڑکی کا سانس پھولا ہوا تھا اور اس کے دونوں پاؤں سے خون رس رہا تھا۔ حویلی کے قریب پہنچتے ہوئے بے چاری اور بے دم ہوتی جا رہی تھی۔ اگر وہ جوان نہ ہوتی تو یقیناً چاروں یہ ہی سمجھتیں کہ وہ آمنہ ہے، لیکن وہ آمنہ نہیں تھی۔

''تو پھر وہ کون تھی؟''

لڑکی حویلی کے دروازے تک پہنچی تھی اور پھولے سانس کے ساتھ زہرہ پھپھو کو دیکھنے لگی۔ زہرہ پھپھو نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے کیا اور پھر اگلے ہی پل زوردار چیخ ماردی تھی۔

''تعبیر......!''

تعبیر بے دم سی ہوکر ان کے وجود پر گری تھی۔

۱۹۷۵ء تک کی کہانی یہاں تک اختتام پذیر ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

۲۰۰۳ء

''اماں جی...... اماں جی...... ! آپ کے لیے کال آئی ہے۔''

ریسپشنسٹ لڑکی نے خاتون ملازمہ کو آواز دے کر پکارا جو فرش پر گیلا کپڑا لگانے میں مصروف تھی۔ وائپر پر ایک وزنی گیلا تاول ڈالے وہ راہداری کی صفائی کرتے ہوئے دور جا رہی تھی جب کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی نے اس سے کچھ کہا تھا۔ روشانے نے لڑکی کو دیکھا۔ اسے شاید آواز تو سنائی دی تھی لیکن پیغام سنائی نہیں دیا تھا۔ اب ویسے بھی اس کی سماعت دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا جسم وقت

سے بہت پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑنے لگا تھا۔ گھٹنوں کا درد تو اسے ایک عرصے سے لاحق تھا۔ اور دل کا درد تو شاید اب قبر میں پہنچا کر ہی اس کی جان چھوڑنے والا تھا۔ ہسپتال سے ہی وہ اپنی آنکھ میں موتیے کا آپریشن بھی دو بار کروا چکی تھی۔ لیکن چیزیں ٹھیک ہونے کے بجائے مزید بگڑتی چلی جارہی تھیں۔ بے حرمتی کے بعد ایک عرصہ اذیت میں گزارنے کے بعد دنیا کی بے ثباتی کچھ اس طرح واضح ہوئی تھی کہ وہ چلتی پھرتی تو نظر آتی تھی لیکن اندر سے جیسے مر چکی تھی۔

''آپ کی کال آئی ہے۔'' ریسپشنسٹ لڑکی نے پھر اونچی آواز میں پکار کر کہا۔ اور پیغام سماعتوں سے ٹکراتے ہی روشانے کے ہاتھ سے وائپر کا اسٹینڈ چھوٹ گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے کس کی کال آئی ہوگی۔ اسے بیس سال ہو چکے تھے اس ہسپتال میں ملازمت کرتے۔ اس کے لیے ان بیس سالوں میں پہلی بار کسی کی کال آئی تھی۔ یہ کال بہت دور سے آئی تھی۔ حویلیاں سے......

گیلے اور گندے ہاتھ دامن سے صاف کرنے کے بعد کانپتے ہاتھوں سے اس نے ریسیور پکڑا تھا۔ نجانے کیا بات تھی کہ وہ ریسیور کو کان سے لگانے کی ہمت نہیں کر پارہی تھی۔

''کیا بات ہے، آپ بات کیوں نہیں کر رہی ہیں؟''

''کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ کس کی کال ہے اور اس سے بات کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔''

روشانے نے کہا اور پھر چارو ناچار ریسیور کو کان سے لگالیا۔ چند لمحے مزید گزارنے کے بعد اس نے ایک گہرا سانس بھرا اور ''ہیلو'' کہنے کی جسارت کی۔ اگلے ہی پل اس کی ساری توقعات پوری ہوگئی تھیں۔ جب دوسری طرف سے اسے چاند کی آواز سنائی دی تھی۔

''روشانے......میری بچی......!'' وہ بری طرح سے رو رہی تھی۔ ''کہاں چلی گئی تھیں تم میری بچی......کتنا تلاش کیا میں نے تمہیں......کتنا ڈھونڈا......اتنے سالوں سے کہاں غائب تھیں تم۔''

روشانے کچھ نہیں بول سکی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں چپ نہیں رہی تھیں۔ ان سے آنسو جاری ہو

چکے تھے۔

''کوئی اس طرح بھی اپنوں سے ناراض ہوتا ہے۔''

''میں ناراض نہیں تھی چاندامی......بس آپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔''

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تم مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئی ہو۔ سامنا تو شاید میں تمہارا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے تمہاری ماں کو وعدہ دیا تھا کہ تمہارا خیال رکھوں گی اور میں یہ وعدہ نبھا ہی نہیں سکی۔''

چاند کا رونا کم نہیں ہو رہا تھا۔ روشانے کی آواز سن لینے پر ہی اس کے دل میں اتنی تڑپ پیدا ہو چکی تھی کہ اسے لگا کہیں یہ دل پھٹ ہی نہ جائے۔

''میری غلطیوں کو اپنے کھاتے میں مت ڈالیں چاندامی...... آپ جانتی ہیں کہ جو کیا میں نے خود اپنے ساتھ کیا۔ آپ تو آخر تک میری بھلائی چاہتی تھیں۔ میں نے بہت خطائیں کی ہیں، بہت زیادہ......''

''ایک ماں کے نزدیک بیٹی کی کوئی خطا نہیں ہوتی ہے۔ وہ صرف اس کا بچپنا ہوتا ہے۔ اس کی ناسمجھی ہوتی ہے۔''

''کچھ گناہ بھی تو ہوتے ہیں۔''

''تمہیں مجھ سے ملنے تو آنا چاہیے تھا۔ اتنے سال ہو گئے، کیا میں تمہیں یاد نہیں آئی؟''

''اپنی ماں کے بعد آپ ہی مجھے سب سے زیادہ یاد آئی ہیں چاندامی......!''

''تو پھر فوراً سے واپس آجاؤ میری بچی...... بالکل دیر نہ کرنا۔''

''حویلیاں کی زمین شاید اب مجھے قبول نہ کر سکے۔ میں اس زمین کے قابل نہیں رہی چاندامی...... میں اس زمین کے قابل نہیں رہی......'' روشانے بری طرح سے رونے لگی تھی۔ ''میں اپنی عزت کا مان کھو چکی ہوں۔ میں داغ دار ہوں۔ اور حویلیاں کی زمین بہت پاک ہے۔ وہ مجھے قبول نہیں کرے گی۔''

''ایسی باتیں نہیں کرتے روشانے...... حویلیاں کی زمین سے پوچھ کر تو دیکھو۔ یہ بتا سکتی تو تمہیں بتاتی کہ یہ برسوں سے کتنی تڑپ سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

''آپ نہیں سوچ سکتیں چاند امی کہ میرے ساتھ کیا کیا ہوا ہے۔ اور جو جو کچھ ہوا ہے مجھے لگتا ہے کہ میری ضد کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''میں سننا نہیں چاہتی میری بچی...... میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ میرا دل درد سے پھٹ جائے گا۔ میں جانتی ہوں کہ کیا ہوا ہوگا۔ وہی جو تمہاری باقی کزنوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ بہتر ہے کہ اس سب کو بھول جاؤ اور واپس آجاؤ۔ دیکھو تم نہیں آئیں تو میں کراچی آجاؤں گی تمہیں لینے...... اور سنو...... تمہاری کزن سارہ اور تمہاری بہن افشیں بھی میرے پاس ہیں۔ اور تعبیر بھی جلد ہی جیل سے رہا ہونے والی ہے۔''

چاند امی نے ایک ساتھ اسے تین خوشی کی خبریں سنا دی تھیں۔ یہ خوشی کی خبریں سن کر بھی روشانے کو کچھ محسوس نہیں ہوا تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا تھا کہ اب خوشی کی خبر بھی اسے خوش نہیں کر پاتی تھی۔ وہ سارہ، افشیں یا تعبیر کے مل جانے کی کیا خوشی محسوس کرتی اس کے تو اپنے ہی روگ ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔

''سنو...... تم حویلیاں آؤ گی یا میں تمہیں لینے آؤں؟'' چاند امی نے کچھ دھونس جماتے ہوئے پوچھا۔

روشانے سے کچھ بولا نہیں گیا۔ ماضی کے سارے دکھ اس کے وجود میں اترتے چلے آئے تھے۔

''بولو روشانے...... میری بچی...... خاموش کیوں ہو۔ کیا تم مجھ سے نہیں ملنا چاہتی ہو؟''

''آپ سے بات ہوگئی یہ ہی کافی ہے چاند امی......'' روشانے نے کہا اور چاند نے گہرا سانس بھرا۔

روشانے کے جذبات کو سمجھنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔

''تمہیں معلوم ہے روشانے...... جب ملک کا بٹوارہ ہوا اور ہم دہلی سے ہجرت کر کے حویلیاں

میں آئے، ان دنوں میری آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا۔ قتل و غارت، پکڑ دھکڑ، چوری چکاری...... اور مجھے لگا کہ میری ساری زندگی اسی ماحول میں گزر جائے گی۔ وہ سب اس قدر ہولناک تھا کہ لگتا تھا کہ ذہن اس سب کو کبھی بھول ہی نہیں پائے گا۔ لیکن پھر حویلیاں نے ہمیں اپنی آغوش میں بھرلیا۔ اس دھرتی نے ہمیں نئی زندگی شروع کرنے میں مدد دی۔ اور آج میں وہ سب یاد کرتی ہوں تو ذہن پر زور ڈالنا پڑتا ہے۔ کچھ یاد نہیں آتا۔ تم بھی ہجرت کر لو روشانے...... سب کچھ بھلا کر حویلیاں آجاؤ، سمجھو کہ ہجرت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔''

چاند نے اس قدر پیار سے روشانے کے زخموں پر مرہم رکھے تھے کہ روشانے کے سارے دکھ دھلنا شروع ہو گئے تھے۔

''میری آنکھیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں روشانے......''

''میں...... میں آتی ہوں چاند امی......'' روشانے نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں فوراً سے آتی ہوں۔ بالکل وقت ضائع نہیں کروں گی۔ میں نے بہت دکھ جھیل لیے ہیں چاند امی...... مجھے اپنی آغوش میں بھرلیں۔'' اور کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر سے رونے لگی تھی۔

''میں تمہیں کبھی خود سے جدا نہیں ہونے دوں گی۔ سب چھوڑ کر واپس آجاؤ میری بچی......''

آنسو صاف کرنے کے بعد روشانے نے ریسیور کو واپس کریڈل پر رکھ دیا۔

''میں جا رہی ہوں۔ میرا بلاوا آ گیا ہے۔ میں یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ باس کو بتا دینا۔''

روشانے نے ریسپشنسٹ لڑکی سے کہا تھا اور پھر اس کے کسی جواب کو سنے بنا وہاں سے باہر کو بھاگ گئی تھی۔ لڑکی چہرے پر حیرت لیے روشانے کو بھاگتے ہوئے راہداری پار کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

آج کا دن کافی اجلا اجلا سا تھا۔ ورنہ پچھلے کافی دنوں سے آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ جو نہ برستی تھیں، نہ چھٹتی تھیں۔ پھر آج سورج فتح یاب ہوا تھا اور زمین والوں پر ضیا ریزی کرنے لگا تھا۔

صحن کے ایک کونے میں بیٹھی آمنہ خاموشی سے اپنا کھانا ختم کر رہی تھی۔ وہ خود کم کھا رہی تھی اور اپنے پاس بیٹھی بلی کو زیادہ کھلا رہی تھی۔ چاند گھر سے باہر جانے سے پہلے آمنہ کو گرم دودھ میں روٹی بھگو کر دے گئی تھی۔ کیونکہ بوڑھی آمنہ کے دانت نہ ہونے کے برابر قائم تھے۔ ایسے میں اس سے کھانا چبانا مشکل ہو جاتا تھا۔ چاند کے اس طرح کرنے سے وہ کسی حد تک اپنا پیٹ بھر لیا جاتی تھی۔ آمنہ ایک چمچہ اپنے منہ میں ڈالنے کے بعد ایک بلی کے لیے فرش پر گرا دیا کرتی تھی۔ دودھ میں بھیگی ہوئی روٹی کو بلی جھٹ سے چاٹ لیتی تھی۔

صحن کے دوسرے کونے میں افشیں فرش پر چپ چاپ بیٹھی آسمان کو کھوج رہی تھی۔ وہ آسمان کے شکم میں تیرتے آزاد پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔ شاید ان پر رشک کر رہی تھی۔ اس نے ایک لمبا عرصہ اذیت بھری قید میں گزارا تھا۔ شاید یہ اسی بات کا دکھ تھا جو اس کی آنکھوں سے نہیں جاتا تھا۔ وہ مدتوں سے اندھیرے میں بند تھی۔ اب روشنی میں آنا اسے جیسے قبول نہیں ہو رہا تھا۔ یا شاید وہ خود کو روشن دنیا کی مخلوق ماننے سے قاصر تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

سارہ نے افشیں سے پوچھا۔ جو فرش سے اونچے دلان پر بیٹھ کر افشیں کے سر پر تیل سے مالش کر رہی تھی۔ افشین کا سر کافی دیر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ سارہ کو مالش کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ کچھ وہ افشیں سے باتیں بھی کرنا چاہتی تھی۔ جب سے افشیں آئی تھی، ایسے خاموش تھی جیسے بولنا بھول چکی ہو۔ افشیں نے اب بھی سارہ کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ تاہم اس نے سر کو نیچے کر لیا تھا۔

''تم مجھے بہت یاد آتی تھیں افشیں ......'' بات بڑھانے کی غرض سے سارہ نے خود سے ہی کہا۔ افشیں اب اس بلی کو دیکھنے لگی تھی جو پیٹ بھر جانے کے بعد اپنا منہ صاف کر رہی تھی۔

''کیا تم بھی مجھے یاد کرتی تھیں؟''

''کبھی کبھی......'' افشیں نے مدھم سے لہجے میں کہا۔ ''جب ماں کی یاد ڈلتی تھی تو باقی سب کی یاد بھی آجاتی تھی۔''

افشیں کی بات پر سارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ لیکن اس نے آنسوؤں کو چپکے سے صاف کر لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ افشیں اس کے آنسو دیکھ کر افسردہ ہو۔ وہ چپ چاپ اس کے سر کی مالش کرتی رہی تھی۔ بے جان بالوں اور بے جان افشیں میں جان ڈالنے میں ابھی نجانے کتنے دن درکار تھے۔ افشیں تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی ہوئی تھی۔ سارہ ہر طرح سے اس کی خوراک کا خیال رکھ رہی تھی۔ وہ اسے دودھ دیتی، یخنی دیتی، لیکن افشیں ایک چمچے کے برابر کھانے کے بعد پیٹ بھر جانے کا کہہ دیتی۔ سارہ نے ارشادی بابا سے کہہ دیا تھا کہ کسی اچھے ڈاکٹر کو حویلی لائے۔ ڈاکٹر ہی شاید کوئی میڈیسن یا وٹامن افشیں کے لیے لکھ دے جنہیں لینے کے بعد افشیں کی بھوک بھی کھل جائے اور ناسور بھی ڈھل جائے۔

حویلی کا درواده کھلنے کی آواز آئی تو آمنہ، سارہ، افشیں سمیت بلی نے بھی دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ چاند حویلی کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''روشانے سے بات ہو گئی۔ میری بچی سے بات ہو گئی میری۔'' اس نے پرجوش لہجے میں بتایا تھا۔

سارہ اور افشیں کھڑی ہو گئی تھیں۔

''وہ آ رہی ہے......وہ حویلیاں آ رہی ہے۔''

''کیا سچ میں......؟'' سارہ کو تو جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں......اس نے کہا ہے کہ وہ آج ہی حویلیاں کے لیے نکلے گی۔ افشیں......! تمہاری بہن

واپس آرہی ہے۔" چاند نے آگے بڑھ کر افشیں کو خود سے لگا لیا۔ "تمہاری بہن آرہی ہے۔ کیا تم خوش ہو افشیں......؟"

"جی...... میں بہت خوش ہوں۔" افشیں نے ایسے لہجے میں کہا تھا جیسے کوئی نئی بات نہ ہو۔ وہ خوشی کا اظہار کرنا بھی بھول گئی تھی۔

"اللہ میری بچیوں کرن اور زارا کی بھی حفاظت فرما...... نجانے کہاں ہیں وہ...... میری آنکھیں ان کو دیکھ لیں تو میں سکون سے مرسکوں گی۔"

"وہ بھی مل جائیں گی چاند امی...... فکر مت کریں۔" سارہ نے یقین دہانی کروائی تھی۔ اور اس کی یقین دہانی میں نجانے ایسا کیا تھا کہ چاند مطمئن ہوگئی تھی۔

سارہ نے اگلے دن صبح ہی اٹھ کر تیاری شروع کر دی تھی۔ وہ روشانے کی پسند کے کھانے بنا رہی تھی۔ حویلی میں جو مکین موجود تھے ان میں سارہ ہی ذہنی اور جسمانی طور پر مضبوط تھی تو وہ خوشی خوشی سارے کام کر رہی تھی۔ اس نے روشانے کی پسند کے چار پانچ کھانے بنائے تھے۔ میٹھے الگ سے تھے۔ صحن کو اچھے سے دھونے کے بعد اس نے ایک کمرا روشانے کے لیے صاف کر دیا تھا۔

روشانے کا انتظار طول پکڑ گیا تھا۔ یا شاید اس کا انتظار اس قدر بھاری تھا کہ ایک ایک لمحہ صدی بن گیا تھا۔ چاند کی تو یہ حالت تھی کہ صبح سے اس کی نظریں حویلی کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ کتنی کتنی دیر دروازے پر کھڑی بھی رہی تھی۔ پھر تھک جانے پر واپس اندر آکر بیٹھ جاتی تھی۔ افشیں بھی دل کو تھامے ہوئے اپنی بہن کا انتظار کر رہی تھی۔ سارہ صبح سے تین چار بار چاند کے کہنے پر بازار جا کر پبلک کال آفس سے ریلوے انکوائری فون کر کے پوچھ چکی تھی کہ کراچی سے پنڈی کی ٹرین کب تک پہنچے گی۔ ایک ٹرین صبح دس بجے پہنچی تھی، ایک دو بجے...... اور ایک نے اب تین بجے پہنچنا تھا۔ پنڈی سے حویلیاں کا سفر ایک گھنٹے کا تھا۔ چاند نے گیارہ بجے والی ٹرین کے حساب سے بارہ بجے تک روشانے کا انتظار کیا

تھا۔ پھر دو بجے والی کے حساب سے تین بجے...... اور اب چار بجنے والے تھے۔ کہاں رہ گئی تھی روشانے......

''ٹرینیں اتنے بھی وقت پر نہیں پہنچتیں چاند امی، جس قدر آپ سوچ رہی ہیں۔ اور ہمیں کیا معلوم کہ روشانے ٹرین سے آ رہی ہے یا بس سے......''

''ہاں...... یہ تو ہے۔''

ملگجی سی شام حویلیاں پر اترنے لگی تھی جب حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ سارہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تھا اور پھر اگلے ہی پل باہر کھڑی روشانے کو خود سے لگا لیا۔ چاند اور افشیں بھی بھاگ کر دروازے تک پہنچی تھیں۔

''میری بچی...... میری جان......!''

چاند نے روشانے کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بھینچ لیا۔ اس کا دل نہ کرتا تھا کہ روشانے کو خود سے الگ کرے۔ بہت سے پل تو رونے میں ہی گزر گئے تھے۔ سالوں کا رونا تھا۔ ایک دن میں ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ افشیں بھی اپنی بہن کو دیکھ کر خوش ہو چکی تھی۔ برسوں بعد اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آئی تھی۔

''مجھے...... مجھے معاف کر دیں چاند امی...... آپ کی بات نہ مان کر دیکھیے میں نے اپنے ساتھ کس قدر برا کر لیا ہے۔''

''ماضی کی کوئی بات مت کرو میری جان...... اسے برا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ تم واپس آ گئی ہو، میرے لیے اس سے بڑی بات اور کوئی نہیں ہے۔''

''چاند امی ٹھیک کہہ رہی ہیں روشانے...... ماضی کو بھول جاؤ۔ جو اذیتیں گزر چکی ہیں ان کو یاد کرنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔'' سارہ نے بھی پیار سے کہا۔

روشانے روتے میں مسکرا دی۔ کراچی سے حویلیاں تک کے طویل سفر کے باوجود وہ ہشاش

بشاش تھی۔ اپنوں سے ملنے کی خوشی اس قدر زیادہ تھی کہ وہ اپنی عمر سے بھی کافی کم نظر آنے لگی تھی۔

سب نے مل کر وہ کھانا کھایا تھا جو سارہ نے سب کے لیے بنایا تھا۔ چاند ایک عرصے کے بعد حویلی میں دستر خوان لگا دیکھ کر اپنے آنسو چھپاتی پھر رہی تھی۔ اسے دین بابا اور صندل رہ رہ کر یاد آتے تھے۔ اور وہ کسی ورد کی طرح دعا کرتی جا رہی تھی کہ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اب حویلی سے کبھی رخصت نہ ہوں۔

''حویلی کی کچھ مرمت کروانی ہے چاند امی......'' چند دن کے بعد اسلام آباد کے لیے نکلتے ہوئے سارہ نے چاند امی سے کہا۔ ''ارشادی بابا کو کہہ دیں۔ وہ خود ہی مزدوروں کا بندوبست کر لیں گے۔ ان سے کہیں کہ اچھا کام کروانا ہے۔ اور ایک ایک چیز کو اس طرح ٹھیک کرنا ہے کہ وہ نئی جیسی لگے۔ قندیلیں، فرش، دیواریں، فرنیچر، پردے......سب کچھ نیا اور جدید لگنا چاہیے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے سارہ......لیکن اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ حویلی میں روغن ہونے پر ہی ایک لاکھ کا خرچا ہو جاتا ہے۔ اور تم جو کہہ رہی ہو وہ تو حویلی کو نئے سرے سے تعمیر کروانے والی بات ہے۔''

''سمجھیں کہ نئے سرے سے تعمیر ہی کروانا ہے۔'' سارہ نے کہا اور پھر اپنی الماری میں سے ڈھیر سارے سونے کے زیوارت نکال کر چاند امی کے سامنے رکھ دیے۔ چاند کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''یہ......یہ سب کہاں سے آیا تمہارے پاس......؟''

''بس......پرانی امانت تھی، اب واپس لے لی ہے۔''

سارہ نے مختصر بات میں بات ختم کر دی تھی۔ اس نے چاند کو نہیں بتایا تھا کہ بستامی کے گھر کو آگ لگانے سے پہلے اس نے سارے زیور، موتی اور ڈھیر ساری نقدی چوری کر لی تھی۔ جو کہ سب کروڑوں میں تھا۔ سارہ نے ابھی بہت کم زیورات چاند کو دکھائے تھے۔ باقی اس کی الماری میں ہی محفوظ تھے۔ وہ چاند کو ساری بات بتا دیتی اگر اسے چاند کے ردعمل کا معلوم نہ ہوتا۔ چاند نے اس سب کو چوری کا مال سمجھنا تھا۔ اور ان پیسوں کو خرچ کرنے سے انکار کر دینا تھا۔ جبکہ سارہ کی دنیا اب بدل چکی تھی۔ بستامی نے ان

سب کو بیچ کر لاکھوں کمائے تھے۔ اس کے گھر سے چوری کرتے ہوئے سارہ کے ذہن میں یہ ہی بات تھی کہ وہ اپنی حرمت کی قیمت اور اپنی زندگی کی قیمت واپس لے رہی ہے۔ اس کی کزنوں نے بہت برا وقت دیکھا تھا۔ اب ان پیسوں سے وہ چاہتی تھی کہ اس کی کزنوں کا ایک ایک دن عید کے جیسا ہو۔

''ان تمام زیورات کو ارشادی بابا کو دے دیجیے گا۔ میرے خیال سے بیس لاکھ کی رقم تو ضرور ہی ہاتھ آ جائے گی۔ اس سے حویلی کا کام کروالیجیے گا۔ اپنی، روشانے، افشیں اور آمنہ کی ضرورتیں پوری کیجیے گا۔''

''کیا یہ زیور تم نے بستامی کے گھر سے چوری کیے ہیں؟'' اور وہ بات جو سارہ چھپا رہی تھی وہ بھلا چاند سے کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔

سارہ نے چونک کر چاند کو دیکھا تھا اور پھر سر جھکاتے ہوئے اپنی کپڑوں کی گٹھڑی کو پکڑ لیا۔

''چلتی ہوں۔ مجھے ابھی کرن اور اپنی بہن زارا کو بھی تلاش کرنا ہے۔'' سارہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ چاند خالی نظروں سے زیورات کو دیکھتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

جب سے ضامن اسلام آباد سے ناراض ہو کر گیا تھا تب سے خیام اور باریشہ گھر میں پریشانی کی حالت میں گھوم رہے تھے۔ شائستہ الگ الگ دونوں سے سوال جواب کر چکی تھیں۔ پھر انہوں نے یہ سوچ کر کہ تینوں دوستوں کا آپس کا کچھ معاملہ ہوگا، سوال کرنے بند کر دیے تھے۔ لیکن وہ خیام کے لیے فکرمند تھیں۔ کیونکہ خیام ضامن کی ناراضی کے بعد چپ ہو کر رہ گیا تھا۔

ضامن کی ناراضی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ خیام ضامن کو کال کر رہا تھا اور وہ اس کی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ میسج کا جواب وہ دے نہیں رہا تھا۔ خیام زویا اور زوہیب کے نمبر پر بھی کال کر چکا تھا اور ضامن نے تب بھی اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''اسے چند دن دو...... بے شک وہ ناراض ہے، لیکن تمہارا دوست ہے۔ زیادہ دیر ناراض نہیں

رہ سکے گا تم سے۔" باریشہ نے خیام کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن خیام نہیں سمجھ پا رہا تھا اور اب تو اتنے دن گزر چکے تھے کہ باریشہ خود بھی پریشان ہونے لگی۔

"تم کراچی چلے جاؤ...... وہاں جا کر اس سے بات کرو۔"

"ہاں...... لیکن زویا آنٹی اور زوہیب انکل کے سامنے اس نے میری انسلٹ کر دی تو میں ان کی نظروں میں بھی گر جاؤں گا۔"

"ضامن ایسا کیوں کرے گا؟"

"اس کے غصے کو نہیں جانتی ہو تم...... وہ غصے میں پاگل ہو جاتا ہے۔"

"وہ میری بھی کال ریسیو نہیں کر رہا...... ورنہ میں اس سے بات کرتی۔"

"یہ ہی بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔"

"مجھے حویلیاں واپس جانا ہے خیام...... مجھے یہاں رہتے ہوئے کافی دن ہو چکے ہیں۔ چاند نانو کی خبر گیری کرنا بھی ضروری ہے۔ میں ایسے وقت میں تمہیں اکیلا تو نہیں چھوڑنا چاہتی...... لیکن حویلیاں جانا بھی ضروری ہے۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم اپنا سامان پیک کرو۔ میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ اور شاید میں بھی کراچی چلا جاؤں۔ ضامن کے غصے کو ایک بار تو جھیلنا ہی ہو گا۔"

"دوستی کی خاطر سب برداشت کر لینا۔" باریشہ نے پیار سے کہا۔

خیام نے گہرا سانس بھرا۔ جیسے ضامن کے متوقع ردعمل سے ڈرا ہوا ہو۔

☆......☆......☆

جالی دار پردے سے آتی دھوپ نے فرش پر دلکش نقش بنا دیا تھا۔ جیسے کسی مچھیرے نے مچھلیوں کے لیے دریا میں جال ڈال رکھا ہو۔ اس کا کچھ حصہ سیاہ پیانو کی چمک دار سطح پر بھی پڑ رہا تھا۔ جس کو دیکھتے

ہوئے ضامن کتنی ہی دیر ساکت بیٹھا رہا تھا۔ پھر اس نے پیانو کا سیاہ پوش اوپر کیا تھا۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو پیانو کی کیز پر مارا تھا۔ ایک بے ڈھنگا سا شور سارے کمرے میں پھیل کر پھر سے خاموش طاری کر گیا تھا۔

ضامن کو یہ کھیل اچھا لگا تھا۔ اس نے پھر سے یہ ہی حرکت کی تھی۔ اس نے کبھی پیانو نہیں بجایا تھا۔ اسے تو اس چیز کا شوق ہی نہیں تھا۔ اور شاید گھر میں کسی کو پیانو کا شوق نہیں تھا لیکن یہ زویا تھی جس نے اسٹیٹس کی وجہ سے مہنگے پیانو کو گھر پر رکھا ہوا تھا۔

ضامن ایک ایک ''کی'' کو چھوتے ہوئے اس کی دھن کو یاد رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر سازوں کے تال میل سے کوئی دھن بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ تیزی سے پیانو پر اپنے ہاتھ چلاتا جا رہا تھا۔ اتنی تیزی سے جتنی تیزی سے وہ ٹائپنگ کیا کرتا تھا۔ بے ہنگم آوازیں شور میں بدل گئی تھیں۔ اور ضامن کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ اس شور کے ساتھ کچھ یادیں اس کے ذہن کے پردے پر اترتی چلی گئی تھیں جو اس کا تنفس تیز کرنے لگی تھیں۔ غصے کی شدت سے ضامن کی ناک پھول گئی تھی۔

دروازے پر کھڑی زویا پہلے تو بہت دیر تک ضامن کی پشت دیکھتی رہی پھر وہ آہستگی سے چلتی ہوئی ضامن کے پاس آئی اور اس نے پیار سے ضامن کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ضامن کی ماں تھی۔ اگر ضامن سوچ رہا تھا کہ وہ اس سے کچھ چھپا سکتا ہے تو یہ اس کی بھول تھی۔ زویا کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہوئے ضامن کی انگلیوں کی جنبش کچھ کم ہوئی تھی۔ اور ساز مدھم ہوتے ہوئے ختم ہو گیا تھا۔ زویا ایسا ہی چاہتی تھی۔ اب کمرے کی گہری خاموش میں وہ ضامن سے باتیں کر سکتی تھی۔

''تمہیں کبھی بھی پیانو کا شوق نہیں رہا...... اگر میں غلط نہیں ہوں تو......'' قریب والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے زویا نے کہا۔

''جی...... ایسا ہی ہے۔''

''پھر آج کیا بات ہوئی کہ تم میوزک روم میں چلے آئے۔''

''بس...... ویسے ہی دل کیا اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا تو شروع ہو گیا۔'' ضامن نے کھو کھلے سے انداز میں کہا تھا۔ زویا نے گہری نظروں سے ضامن کو دیکھا۔

''بے جان چیزوں کے ساتھ وقت گزارنے کو تب ہی دل کرتا ہے جب جاندار چیزوں سے دل بھر گیا ہو۔'' زویا نے کہا تھا یا شاید بتایا تھا۔

ضامن خاموش رہا تھا۔ لیکن زویا کی بات کے ردعمل کے طور پر اس کا چہرہ کچھ مزید سرخ ہو گیا تھا۔ جیسے کوئی بہت ہی تلخ بات پھر سے یاد آ گئی ہو۔

''باریشہ کیسی ہے؟ اور خیام......؟''

''پتا نہیں...... ٹھیک ہی ہوں گے دونوں...... مجھے ان کی کوئی خبر نہیں...... اور نہ ہی میں اب رکھنا چاہتا ہوں۔''

''خیام سے ناراض ہو کیا؟ تم اس کی کال پک نہیں کر رہے۔ کبھی وہ تمہارے ڈیڈ کے نمبر پر کال کرتا ہے اور کبھی میرے نمبر پر۔''

زویا کی بات پر ضامن خاموش رہا۔ وہ اس سارے موضوع سے بچنا چاہ رہا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس ''حادثے'' پر کسی سے بات بھی کرنا چاہ رہا تھا اور شاید زویا سے ہی کر سکتا تھا۔

''تم دونوں کی دوستی اس قدر گہری رہی ہے کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کسی بڑی بات کے بنا تم ایسا کر سکتے ہو۔''

''بات بڑی ہی ہے۔ بہت بڑی......''

''مجھے بتاؤ، شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔'' زویا نے پیار سے ضامن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ

رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''خیام نے مجھے ہرٹ کیا ہے۔اور باریشہ نے بھی۔لیکن مجھے باریشہ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ خیام سے ہے۔وہ میرا دوست تھا۔اسے میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''کیسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟'' زویا بہت عمدگی سے ضامن کو کریدتے ہوئے ساری بات جاننا چاہ رہی تھی۔

''اس نے میری آنکھوں میں دھول جھونکی۔مجھ سے چھپ کر باریشہ کے ساتھ محبت کا کھیل کھیلا......اور اس قدر چالاکی سے سب کیا کہ باریشہ جو کہ مجھے چاہتی تھی اب خیام کے علاوہ اسے کچھ اور نظر ہی نہیں آتا ہے۔'' ضامن نے ساری بات بتادی۔

جس پر زویا کو حیرت اور صدمہ ایک ساتھ ہوا۔وہ باریشہ کو اپنی بہو بنا کر اپنے بھائی کی نشانی کو اپنے گھر لانا چاہتی تھی۔وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کام میں کوئی رکاوٹ بنے گی۔وہ خود حویلیاں جا کر چاند سے ہر بات کی معافی مانگنے کے لیے تیار تھی۔لیکن اب ضامن نے اسے جو بتایا تھا وہ جان کر زویا کو اپنی خواہش قتل ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

اور قاتل کا نام تھا خیام......

''حیرت ہے۔بڑا بدتمیز نکلا خیام......دوستی کا کچھ تو لحاظ کرتا۔''

''باریشہ کی محبت میں وہ بچپن کی دوستی بھول گیا ہے۔''

''دراصل چھوٹے شہر کے لوگ کہیں نہ کہیں چھوٹا پن ضرور دکھاتے ہیں۔''

ضامن کیا تبصرہ کرتا۔وہ بھی زویا کی ہی طرح سوچنے لگا تھا۔

''مجھے خیام پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا۔لیکن جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ اسلام آباد کا باسی ہے تو میں نے دل میں دعا کی تھی کہ اس کی چھوٹی سوچ سے میرے بیٹے کو محفوظ رکھنا۔پہاڑی علاقوں کے

لوگ تو ویسے بھی کٹھور ہوتے ہیں۔ دیکھو...... کیسا کٹھور پن دکھایا ہے اس نے...... مجھے تو سن کر یقین نہیں آرہا۔ ایک طرف پچیس سالہ دوستی اور دوسری طرف چند ماہ کی محبت...... اس نے محبت کو پانے کے لیے دوست کو دھوکا دینے کو ترجیح دی۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں ممی...... میں نے ہمیشہ ڈیڈ کی نظر سے دنیا کو دیکھا۔ اور تب ہی دھوکا کھا گیا۔ مجھے آپ کی نظر سے لوگوں کو جج کرنا چاہیے تھا۔ آپ کا مشاہدہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ آپ ڈیڈ کی طرح سمجھوتے کرنے اور درگزر کرنے کی قائل نہیں ہیں۔"

ضامن نے کھلے دل سے ماں کی تعریف کی تھی۔ اسی ماں کی جس سے پچھلے دنوں وہ نفرت کرنے لگا تھا۔ لیکن چونکہ اب وہ خود ایک مسئلے میں الجھ گیا تھا تو ایسے میں صرف زویا ہی اس کی مدد کرسکتی تھی۔ زوہیب سے بات چیت بے کار تھی۔ زوہیب کا جواب ضامن پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے ضامن کو سب کچھ قبول کرلینے کی تلقین کرنا تھی۔ یہ زویا تھی جو کوئی حل نکال سکتی تھی۔ اور ضامن اس مسئلے کا حل چاہتا تھا۔ اسے ہرگز قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ضامن صرف چند دن ہی بھولا رہا تھا کہ وہ زویا کا بیٹا ہے۔ وہ زویا سے نفرت کرے یا محبت...... وہ زویا کا بیٹا ہی رہنے والا تھا اور زویا...... وہ مرتے دم تک زویا رہنے والی تھی۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے بدل نہیں سکتی تھی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو پریشان دیکھ کر وہ کسی بھی طرح کا حل نکالتے ہوئے جھجکنے والی نہیں تھی۔

"تم...... تم اب کیا چاہتے ہو ضامن...... کیا تم خیام کے دھوکے کو قبول کرچکے ہو، یا تم ابھی بھی باریشہ کو چاہتے ہو؟"

"میں نے بہت کوشش کی خیام کی دھوکا دہی کو برداشت کرنے کی...... لیکن مجھ سے ایسا نہیں ہو سکا مام...... اور شاید ہو بھی نہ سکے گا۔"

"یہ چیز تمہیں ذہنی اذیت دے گی میری جان...... بہتر ہے کہ تم جلد سے جلد اس کا کوئی حل

سوچو...... یا تو خیام کے دھوکے سمیت اس کو بھی ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ...... یا باریشہ کو پانے کے لیے سر دھڑ کی بازی کھیل جاؤ۔"

زویا نے کہا تھا تو ضامن نے چونک کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ زویا اس سے کیا کہنا چاہ رہی تھی؟ وہ اسے کس کام کے لیے اکسا رہی تھی۔

یا یہ خود ضامن کا ذہن تھا جو کسی رخ اکسائے جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔